جلد ۱۲ شمارہ ۸ اگست ۲۰۰۰ء جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ

فہرست

شذرات

ختم نبوت اور ہمارا رویہ	محمد بلال	۲
''میلاد کارڈ'' اور ''کرسمس کارڈ''	″	۴
میل ملاپ کی اہمیت	″	۶
حادثے کا پیغام	منظور الحسن	۸

قرآنیات

البیان: البقرہ ۲: ۱۰۴-۱۰۷ (۲۰)	جاوید احمد غامدی	۱۲

معارف نبوی

ایمان سے محرومی کی نوعیت، علامات نفاق، منافقت کی نشانیاں، منافق کی مثال	طالب محسن	۱۵

دین و دانش

آداب و شعائر (۳)	جاوید احمد غامدی	۲۴
تصویر (۴)	محمد رفیع مفتی	۲۷
اجتہاد کی ضرورت اور اہمیت	جاوید احمد غامدی / منظور الحسن	۴۰
قسم اور کفارۂ قسم کے احکام	محمد وسیم اختر مفتی	۴۴

اصلاح و دعوت

حسن کارکردگی	طالب محسن	۵۱
صبر	″	۵۲
اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی	منظور الحسن	۵۴

یسئلون

متفرق سوالات	جاوید احمد غامدی / منظور الحسن	۵۷
متفرق سوالات	طالب محسن	۶۱

نقطۂ نظر

ایک حدیث کی تحقیق	ابو سلمان سراج الاسلام حنیف	۶۳

خیال و خامہ

غزل	جاوید احمد غامدی	۶۷

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ختم نبوت اور ہمارا رویہ

قومی سیرت کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے صدرِ پاکستان محمد رفیق تارڑ صاحب نے کہا ہے کہ :

''عقیدۂ ختمِ نبوت ہی دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک امت ہونے کا اعزاز بخشتا ہے۔ پاکستان میں اس عقیدے کے منافی کسی سرگرمی کی گنجایش ہے اور نہ آیندہ کبھی ہو گی۔'' (جنگ، ۱۸ جون ۲۰۰۰)

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ عقیدۂ ختمِ نبوت کی بے پناہ اہمیت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے انبیاو رسل کے مقابلے میں اپنے امتیازات بیان کرتے ہوئے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ میں خاتم النبیین ہوں۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے ہاں ختمِ نبوت کا مفہوم بہت محدود اور سطحی لیا جاتا ہے۔

ختمِ نبوت کے معاملے میں غیر معمولی طور پر جذبات و احساسات کا اظہار کرنے والے چھوٹے بڑے مختلف مذہبی رہنما بھی اس سے مراد صرف یہ لیتے ہیں کہ اب کوئی اور نبی نہیں آئے گا۔ حالانکہ ختمِ نبوت کا مطلب یہی نہیں ہے کہ نبیوں کی آمد کا سلسلہ ختم ہو گیا، بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اب نبوت اپنی حقیقت کے اعتبار سے بھی ختم ہو گئی ہے۔ اب کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے خدا سے کلام کیا ہے، اس پر وحی آئی ہے، اس کی فرشتے سے ملاقات ہوئی، اسے الہام ہوا، اس لیے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

''نبوت میں سے صرف مبشرات باقی رہ گئے ہیں۔ لوگوں نے پوچھا: یہ مبشرات کیا ہیں ؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا خواب۔'' (بخاری کتاب، التعبیر)

ہمارے ہاں اگر کوئی شخص نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے تو روایتی مذہبی رہنما اور عام مذہبی لوگ سخت غم و غصہ کا اظہار کرتے ہیں۔ اسے غیر مسلم قرار دینے کے لیے تحریک کا آغاز کر دیتے ہیں، بلکہ اس معاملے میں عامتہ الناس کے جذبات اس قدر بھڑکا دیتے ہیں کہ وہ نئے ''نبی'' کو ماننے والوں کے گھروں اور دکانوں کو نذرِ آتش کر دیتے

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ہیں، مگر اس ملک میں ایسی کتابیں بھی موجود ہیں جن میں بعض مذہبی شخصیات نے یہ صاف صاف کہا ہے کہ:

"اس راہ کے مسافروں کو مکاشفات و مشاہدات کی نعمت ابتدا ہی میں حاصل ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ بیداری کی حالت میں نبیوں کی ارواح اور فرشتوں کا مشاہدہ کرتے، ان کی آوازیں سنتے اور ان سے فائدے حاصل کرتے ہیں"...... "اور حق جہاں یہ ہستی گھومتی ہے، اس کے ساتھ ہی گھومتا رہتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہستی ملاءاعلیٰ کے ساتھ شامل اور معصوم ہوتی ہے۔ چنانچہ حق وہی قرار پاتا ہے جو اس کے سینے سے نمایاں ہوتا ہے، پس حق اس ہستی کے تابع ہوتا ہے، وہ حق کے تابع نہیں ہوتی"..... "شیخ اپنے مریدوں کے لیے اسی طرح الہام کا امین ہے، جس طرح جبریل امینِ وحی ہیں۔ پھر جس طرح جبریل وحی میں کوئی خیانت نہیں کرتے، اسی طرح شیخ الہام میں خیانت نہیں کرتا اور جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے نفس کی خواہش سے نہیں بولتے، اسی طرح شیخ بھی ظاہر و باطن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی پیروی کرتا ہے، وہ بھی اپنے نفس کی خواہش سے نہیں بولتا"..... "میں نے خواب میں دیکھا کہ مجھے قائم الزماں کے منصب پر فائز کیا گیا ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے نظامِ خیر میں سے کسی چیز کا ارادہ کریں گے تو اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے آلۂ کار مجھے بنائیں گے"..... "اے جماعتِ انبیا، تمھیں صرف نبی کا لقب دیا گیا ہے اور ہمیں وہ کچھ دیا گیا جس سے تم محروم ہی رہے۔"

بلاشبہ اس قسم کی باتیں کرنا بھی نبوت کا دعویٰ کرنا ہے۔ اس قسم کی باتیں کرنا بھی عقیدۂ ختمِ نبوت کی نفی کرنا ہے۔ اس قسم کی باتیں کرنا بھی امت میں ایک نئی امت پیدا کرنا ہے، مگر اس پر ہمارے ملک کے صدر کوئی اعتراض کرتے ہیں اور نہ وزیر اعظم سختی سے کام لیتے ہیں، نہ روایتی مذہبی رہنما کوئی تحریک چلاتے ہیں اور نہ عام مذہبی لوگوں کے جذبات بھڑکتے ہیں، بلکہ ایسی کتابیں اور ایسی باتیں کرنے والی شخصیات ہمارے ہاں غیر معمولی عزت، احترام اور تقدس کی حق دار قرار پاتی ہیں۔

یہ عجیب و غریب تضاد جہالت پر مبنی ہے یا منافقت پر؟ اس کے بارے میں تو ہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے البتہ یہ دعا ضرور کر سکتے ہیں کہ عالم کا پروردگار ہمیں ختمِ نبوت کے مفہوم کو اس کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور ختمِ نبوت کے منافی ہر بات پر تنقید کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔

—— محمد بلال

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

''میلاد کارڈ'' اور ''کرسمس کارڈ''

شاعر اور کالم نویس جناب اجمل نیازی نے اپنے ایک کالم میں ''عید میلاد سیرت کانفرنس اور ہیپی کرسمس'' کے عنوان سے لکھا ہے:

''عید مید کے جلوس دیکھے تو مجھے کرسمس یاد آگئی۔ میں نے ان دنوں بھی کرسمس دیکھی جب عید میلاد کا میلہ نہیں ہوتا تھا۔ ہمیں مسیحیوں کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ مجھے ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کی طرف سے میلاد کا کارڈ ملا۔ میں خوش ہوا۔ مجھے جے سالک کا ہیپی کرسمس کارڈ یاد آگیا۔'' (روزنامہ دن، ۱۸ جون ۲۰۰۰)

نیازی صاحب کی یہ بات پڑھ کر مجھے بھی ایک بات یاد آگئی۔ ایک مولوی صاحب ''جشنِ عید میلادالنبی'' کے حق میں دلائل دیتے ہوئے فرما رہے تھے کہ ''بعض لوگ یہ جشن منانے کے قائل نہیں ہیں۔ وہ ہمارے اس جشن منانے پر تنقید کرتے ہیں، جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی حضرت عیسیٰ کا یومِ پیدایش مناتے ہیں تو ہم اپنے نبی کا یومِ پیدایش کیوں نہ منائیں۔'' میں نے جب مولوی صاحب کی یہ بات سنی تو مجھے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد یاد آگیا تھا:

''حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لازماً اپنے سے پہلے لوگوں کی پیروی کرو گے۔ قدم بہ قدم۔ یہاں تک کہ وہ گوہ کے بل میں گھسیں گے تو تم بھی گھسو گے۔ ہم نے پوچھا: یارسول اللہ، (کیا آپ کی مراد) یہود و نصاریٰ ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''اور کون۔'' (بخاری، احادیث الانبیا)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یاد آتے ہی مجھے بہت حیرت، تشویش اور پریشانی ہوئی کہ آپ کے ساتھ یہ کیسی محبت کا اظہار کیا جا رہا ہے جس میں آپ ہی کی ہدایت کو پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ یہود و نصاریٰ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل تو یہ تھا کہ آپ ان کی صحیح باتوں کو بھی اختیار کرتے ہوئے ان کے اور اپنے مابین امتیاز قائم کیا کرتے تھے۔

مشہور واقعہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ یہودی دس محرم کو روزہ رکھتے ہیں۔ آپ کے دریافت کرنے پر یہودیوں نے اس کی یہ وجہ بتائی کہ اس روز خدا نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم (بنی اسرائیل) کو (فرعون کی غلامی) سے نجات دی تھی اور فرعون اور اس کی قوم کو غرق کیا تھا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے شکرانے کے طور پر اس روز روزہ رکھا، اس لیے ہم بھی روزہ رکھتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم تم سے زیادہ حق دار ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کریں۔ چنانچہ آپ نے خود بھی روزہ رکھا اور دوسروں کو بھی یہ روزہ رکھنے کی ہدایت کی اور (یہودیوں کی مشابہت سے بچنے کے لیے) فرمایا کہ اگر میں اگلے سال زندہ رہا تو (محرم کی) نویں تاریخ کو بھی روزہ رکھوں گا۔

یہ تو وہ باتیں ہیں جن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا مگر مسلمانوں نے انھیں اختیار کیا۔ اب ہم ان باتوں کا ذکر کرتے ہیں جن پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کرنے کی ہدایت فرمائی مگر مسلمانوں نے ان کو کوئی اہمیت نہ دی۔ آپ نے فرمایا:

"میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں، جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔" (مشکوٰۃ مناقب الصحابہ)

"میری امت پر لازماً وہ وقت آئے گا جو بنی اسرائیل پر آیا۔ قدم بہ قدم۔ یہاں تک اگر ان میں سے کوئی اپنی ماں کے پاس علانیہ گیا تو میری امت میں بھی ایسا شخص ہو گا جو یہ کام کرے گا۔ بنی اسرائیل بہتر (۷۲) فرقوں میں تقسیم ہوئے، میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں تقسیم ہو گی۔ ان میں سے ہر گروہ آگ میں جائے گا سوائے ایک کے۔ لوگوں نے پوچھا: یہ کون سا گروہ ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ جو اس راستے پر چلا جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں۔" (ترمذی، کتاب الایمان)

اسی طرح فرمانِ الٰہی ہے:

"اور جو کوئی راہِ ہدایت واضح ہو چکنے کے بعد رسول کی مخالفت اور مومنین (یعنی صحابۂ کرام) کے راستے کے سوا کسی اور راستے کی پیروی کرے گا تو ہم اس کو اسی راہ پر ڈال دیں گے جس پر وہ پڑا اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔" (النساء ۴: ۱۱۵)

حبِ رسول کے معاملے میں صحابۂ کرام جیسی ہستیاں جس اعلیٰ مقام پر تھیں، اس سے اختلاف کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ ان ہستیوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یومِ پیدایش پر کبھی اس طرح کی تقریبات کا انعقاد نہیں کیا، اس سے بھی اختلاف کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم صحابۂ کرام کی قدم بہ قدم پیروی کر کے حبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اظہار کریں اور خود کو اس گروہ میں شامل کر لیں جو قیامت کے روز جہنم میں جانے سے بچ جائے گا۔

—— محمد بلال

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

میل ملاپ کی اہمیت

پچھلے دنوں اسلام آباد میں ادارۂ ''جنگ'' نے ایک ''میڈیا کانفرنس'' کا انعقاد کیا، جس میں مختلف ممالک کے صحافی حضرات نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں جن بھارتی صحافیوں نے شرکت کی، ان میں بھارت کے ایک ہفت روزہ ''آوٹ لک'' کے چیف ایڈیٹر مسٹر ونود مہتہ بھی موجود تھے۔ انھوں نے پاک بھارت مذاکرات کے حوالے سے ایک پاکستانی صحافی سے بات چیت کرتے ہوئے کہا:

''پاکستان سے مذاکرات کا آغاز کرنے کے حوالے سے میں کلدیپ نیر (بھارت کے ایک صحافی) سے بہت آگے ہوں اور ہم نے بہت سے لوگوں کو اپنے نقطۂ نظر کا حامی بنایا ہے۔''.... ''۱۲ اکتوبر کے بعد بالخصوص پاکستان سے مذاکرات کی حمایت کرنے والی لابی دہلی میں بہت کمزور ہو گئی تھی لیکن ہم نے جدوجہد جاری رکھی پھر ہماری طاقت میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا اور آج میں کہہ سکتا ہوں کہ مذاکرات کے دوبارہ فوری آغاز کی حمایت کرنے والوں اور اس کی مخالفت کرنے والوں کا پلڑا برابر ہو چکا ہے اور جلد ہی ہمارا پلڑا بھاری ہو جائے گا۔''.... ''میں جب پاکستان آتا ہوں، لوگوں سے ملتا ہوں تو میں بالکل نہیں سمجھ پاتا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اس قدر شدید اختلافات کیوں موجود ہیں۔'' (جنگ، ۹ جولائی ۲۰۰۰)

اس میں شبہ نہیں کہ پاکستان اور بھارت کی اکثریت دونوں ممالک کے مسائل پرُ امن طریقے سے حل کرنے کی خواہاں ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو جنگ و جدال اور نفرت و عداوت کو پسند کرتے ہیں مگر ان کم لوگوں کے اثرات بہت زیادہ ہیں۔ یہ کم لوگ ہمیشہ بھارت کی بری باتوں اور برے لوگوں کو نمایاں کرتے رہتے ہیں، جس کی وجہ سے دونوں ملکوں کی فضا میں تناؤ کی کیفیت ہر وقت موجود رہتی ہے۔ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستان اور بھارت کے افراد کے لیے زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے سے ملنے کے مواقع پیدا کیے جائیں۔ امید ہے میل ملاپ سے تعلقات میں جو تناؤ ہے، اس میں کمی آئے گی، دوسرے کی بات سننے اور اپنی بات سنانے کی سہولت پیدا ہو گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ غلط فہمیاں دور ہوں گی جو جنگ و جدال اور نفرت و عداوت کو پسند کرنے والے افراد نے پیدا کر رکھی ہیں اور ملکی وسائل کو عوام کی زندگی آسان کرنے پر صرف کرنے کے بجائے گولہ و بارود پر خرچ کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ حالانکہ کم وسائل اور بے پناہ مسائل رکھنے والے ممالک

کے لیے جنگ کسی بھی مسئلے کا حل نہیں ہے، ان کے لیے تو جنگ مزید مسائل پیدا کرنے کا ہی باعث بنے گی۔ بھارت کے متشدد لوگوں کے بیانات پڑھ پڑھ کر ہمارے ہاں بھارت کا ایک خاص تاثر بنا ہوا تھا، مسٹر مہتہ کی باتوں سے یہ تاثر کچھ تبدیل ہوا ہے۔

بھارت کے ساتھ تعلقات بہتر کرنے کے معاملے میں ہمارے ہاں دو نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ پہلے بھارت مسئلۂ کشمیر حل کرے، اس کے بعد اس کے ساتھ تعلقات بہتر کرنے چاہییں، اس لیے کہ بڑا مسئلہ، مسئلۂ کشمیر ہے، جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا، اس وقت تک باہمی تعلقات کے بہتر ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ پہلے بھارت کے ساتھ تعلقات بہتر کیے جائیں، باہمی تعلقات میں تناؤ ختم کیا جائے، اس کے بعد مسئلۂ کشمیر حل کرنے کی کوشش کی جائے، اس لیے کہ بہتر تعلقات کی فضا میں مسائل پرُامن ذرائع سے حل کرنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ ہمارے نزدیک دوسرا نقطۂ نظر صحیح ہے۔

مذکورہ میڈیا کانفرنس کے حوالے سے دونوں ملکوں کے افراد کے باہمی میل ملاپ کے مثبت اثرات کی وضاحت کرتے ہوئے بزرگ صحافی جناب ارشاد احمد حقانی لکھتے ہیں:

> ''بھارتی صحافیوں نے پاکستان کے بارے میں بہت سے حوالوں سے اپنے اپنے ذہنوں میں جو تاثر یا نقشہ قائم کر رکھا تھا اس سفر کے نتیجے میں وہ اس پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور ہوئے ہوں گے۔ ان کے بہت سے غلط تصورات کسی نہ کسی حد تک درست ہوئے ہوں گے..... مسٹر کلدیپ نیر نے دہلی واپس جا کر اپنے حالیہ سفرِ پاکستان پر جو پہلا کالم لکھا ہے، اس سے میرے مذکورہ تاثر کی توثیق ہوتی ہے.....اس سے جنوبی ایشیا کی فضا کو بہتر بنانے میں مدد ملے گی۔'' (جنگ ۹ جولائی ۲۰۰۰)

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ باہمی میل ملاپ کے اثرات کس قدر مثبت ہوتے ہیں۔ یہاں عمرانیات کا یہ نکتہ بیان کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ انسان کے دوسرے انسانوں سے متاثر ہونے یا متاثر کرنے کے لیے ضروری نہیں ہوتا کہ بالمشافہ ملاقات ہی کی جائے، ٹیلی فون، خط کتابت، رسالوں اور کتابوں کے تبادلے سے بھی یہ کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ بھارت کے ساتھ کتابوں کی خرید و فروخت میں خاصی مشکلات ہیں، ان مشکلات کو ختم کرنے کے لیے اقدامات کرنے چاہییں۔

مختلف پہلوؤں سے اتنی مفید کانفرنس منعقد کرنے پر ادارۂ ''جنگ'' واقعتہً مبارک باد کا مستحق ہے۔ دوسرے اداروں کے اکابر کو بھی ایسی کانفرنسیں منعقد کرنے پر غور کرنا چاہیے۔

—— محمد بلال

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

حادثے کا پیغام

گزشتہ ماہ برطانیہ میں ڈوور کی بندرگاہ پر ایک ٹرک کے کنٹینر سے ۵۸ افراد کی نعشیں برآمد ہوئیں۔ تحقیقات سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ان میں سے بیشتر کا تعلق ایشیائی ممالک سے ہے۔ ان لوگوں نے برطانیہ میں غیر قانونی طور پر داخل ہونے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا۔ کنٹینر میں آکسیجن کی کمی اور ٹھنڈک کی زیادتی ان کی ہلاکت کا باعث بنی۔ اس موقع پر مقامی ذمہ داران نے یہ بیان دیا کہ ہر سال مختلف پس ماندہ ممالک سے تعلق رکھنے والے سیکڑوں تارکینِ وطن اس بندرگاہ سے گرفتار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے وطنوں اور گھروں کو چھوڑ کر یورپ، امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ علاقوں میں تلاشِ روزگار کے لیے نکلتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنی جان، اپنی عزت، اپنے وقار، اپنی اخلاقی اقدار اور اپنے خاندان کے مستقبل کو بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔

اس واقعے کو حادثہ کہا جائے، خودکشی سے موسوم کیا جائے یا قتل سے تعبیر کیا جائے، بہرحال یہ ایک ایسا سانحہ ہے جس پر اقوامِ عالم کے ہر طبقے کو اپنے اپنے دائرۂ فکر و عمل کے اعتبار سے متفکر ہونا چاہیے۔ اس سانحے نے اقوامِ عالم کے ہر طبقے کو کوئی نہ کوئی پیغام دیا ہے۔ کاش وہ اس پیغام کو دھیان سے سنیں اور اس کے مطابق اپنے رویوں اور اہداف کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔

اقوامِ عالم کا ایک طبقہ وہ ہے جس کے ہاتھ میں کرۂ ارض کے نظمِ اجتماعی کی عنانِ اقتدار ہے۔ یہ طبقہ امریکہ اور یورپ کی اقوام پر مشتمل ہے۔ حکمرانوں کی یہ جماعت اپنے آپ کو اس زمانے میں مساواتِ انسانی کا سب سے بڑا علم بردار قرار دیتی ہے۔ اس سانحے نے اسے یہ پیغام دیا ہے کہ وہ دنیا میں اپنی بچھائی ہوئی معیشت کی بساط کا از سرِ نو جائزہ لے اور جانے کہ اُس کے نظام کا وہ کون کون سا ظالمانہ طریقِ عمل ہے جو روز بروز غریب کو غریب تر اور امیر کو امیر تر بناتا چلا جا رہا ہے؟ وہ اس پر غور کرے کہ کیا وجہ ہے کہ لوگ اپنے وطنوں کی فطری محبت کو قربان کر کے ایک سیلِ رواں کی طرح ان کے ملکوں کی طرف امڈے چلے آ رہے ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ جب وہ پس ماندہ ممالک سے مزدوروں اور محنت کشوں کی بھرتی کا اعلان کرتے ہیں تو لاکھوں کی تعداد میں لوگ کم سے کم اجرت پر اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے بخوشی تیار ہو جاتے ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ ترقی پزیر ممالک ہر وقت ان

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور ان کی سالانہ آمدن کا بیشتر حصہ قرضوں کے سود کی ادائیگی میں صرف ہوتا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ کچھ غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ کرۂ ارض پر اس ظلم کا منبع ان کا قائم کردہ نظام ہے۔ چنانچہ وہ نظریہ اور عمل کی دوئی کو دور کریں اور دنیا میں منصفانہ نظامِ معیشت کے احیا کے لیے سرگرمِ عمل ہوں۔ وہ اپنے مفادات کو حاصل کرتے وقت اتنا خیال ضرور کر لیں کہ کہیں اس کے نتیجے میں انسان زندگی کی بنیادی ضروریات ہی سے تو محروم نہیں ہو رہے۔ وہ دنیا پر اپنی بادشاہی اسلحے کے زور سے نہیں بلکہ علم و اخلاق کی قوت سے قائم کریں۔ ان کا یہ رویہ دنیا میں خوش حالی اور امن و سلامتی کی بنیاد بن سکتا ہے۔

اقوامِ عالم کا ایک دوسرا طبقہ معاشی اعتبار سے پس ماندہ قومیں ہیں۔ ان اقوام کو بھی اس سانحے نے ایک پیغام دیا ہے۔ وہ اس پر غور کریں کہ جس غربت و افلاس کا وہ شکار ہیں اس میں ان کا اپنا کتنا کردار ہے؟ کیا اس سے نکلنے کی انھوں نے کوئی منصوبہ بندی کی ہے؟ وہ اپنے ماہرینِ فن اور باصلاحیت افراد کو اس پر مامور کریں کہ وہ اپنی قوم کو ان مصائب سے نکالنے کے لیے جدوجہد کریں۔ وہ اپنی قوم کو مایوسی کے اندھیروں سے نکالیں اور اس میں ترقی کی امید پیدا کریں۔ وہ اس بات کو سمجھیں کہ موجودہ زمانے میں قوموں کی ترقی کا فیصلہ میدانِ جنگ میں نہیں، بلکہ میدانِ معیشت میں ہو رہا ہے۔ وہ اس پر غور کریں کہ بڑی طاقتوں سے معاندت اور کنفرنٹیشن کے بغیر وہ کس طرح اپنی ترقی کی منزل کو حاصل کر سکتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اقوامِ عالم کا ایک تیسرا طبقہ امتِ مسلمہ ہے۔ مسلمانوں کے لیے اس سانحے کا پیغام گوناں گوں پہلوؤں سے ہے۔ ایک پہلو سے اس کا پیغام یہ ہے کہ مسلمان آخرت کی یاددہانی کے عمل کو تیز سے تیز تر کر دیں۔ گزشتہ صدی میں بد قسمتی سے مسلمانوں نے اپنی اس ذمہ داری کو یکسر بھلائے رکھا ہے۔ وہ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ انسانیت کی فلاح کا واحد راستہ آخرت کا استحضار ہے تو یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس پیغام کو دنیا کے ہر شخص تک پہنچانے کے لیے جدوجہد کریں۔ جس شخص تک بھی وہ رسائی حاصل کر سکتے ہیں وہ اسے آخرت کی جواب دہی کے بارے میں خبردار کریں۔ آخرت کی یہ تذکیر قرآنِ مجید کی ہدایت کے مطابق مجادلۂ احسن کے اسلوب میں ہونی چاہیے۔ یعنی وہ زبردستی اور دھونس کا طریقہ نہ اختیار کریں بلکہ حکمت اور محبت کے ساتھ اپنی بات پیش کریں۔ وہ اپنے مدعوین کے ساتھ معاشرتی روابط کو ہرگز منقطع نہ ہونے دیں۔ وہ اپنی بات کو قوی استدلال کے ساتھ پیش کریں۔ وہ اس پیغام کو پہنچانے کے لیے جدید تمدن کے تمام ذرائع کو اختیار کریں۔ ان کی اس تذکیر اور یاددہانی کا یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اس سے متاثر ہو کر ایک طرف دنیا کے کارپرداز عناصر دنیا سے معاشی بے انصافی

کو ختم کرنے کے لیے سر گرمِ عمل ہو جائیں اور دوسری طرف معاشی بے انصافی کا شکار ہونے والے لوگ اسے اللہ کی طرف سے ایک آزمایش سمجھ کر صبر اور قناعت کا رویہ اختیار کریں۔

دوسرے پہلو سے مسلمانوں کے لیے اس سانحے کا پیغام یہ ہے کہ وہ اپنے اندر مسلمہ اخلاقی اقدار کو پوری شان کے ساتھ قائم کریں۔ وہ عدل وانصاف کو اس سطح پر لے جائیں کہ اگر اس کی زد ان کی ذات پر بھی پڑے تو وہ اسے خوش دلی سے قبول کر لیں۔ وہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر قانون کی پاس داری کو اپنا شعار بنائیں۔ وہ قانون شکن نہیں بلکہ قانون کے محافظ بنیں۔ صبر، برداشت اور رواداری کی ایسی خو قائم کریں کہ بدترین مخالف بھی بلا جھجک اپنی ہر بات ان کے سامنے پیش کر سکیں۔ اشتعال، شر انگیزی اور بدتمیزی کے الفاظ ان کی لغت سے خارج ہو جائیں۔ وہ اپنے اندر سے دھوکا دہی کے تمام مظاہر کو ختم کر دیں اور اس بات پر غور کریں کہ کیا وجہ ہے کہ اہلِ یورپ کی مصنوعات اور خوراک کو دنیا میں پورے اعتماد کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے جبکہ ان کے ہاں تیار ہونے والی چیزیں ناقابلِ قبول ہوتی ہیں اور ستم ظریفی تو یہ ہے کہ خود مسلمان بھی ان پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ یوں لگتا ہے کہ ساکھ نام کی کوئی چیز ہی ان کے پاس نہیں ہے۔ دنیا میں ہم مسلمانوں کا تعارف اس کے سوا اور کیا ہے کہ یہ محض اپنے جذبات کے اسیر ہوتے ہیں، علم و عقل سے گریز وفرار اختیار کرتے ہیں، دھوکا دہی اور دھاندلی ان کا شیوہ ہے، جھوٹ اور بددیانتی ان کی عادت ہے، اپنی بات منوانے کے لیے یہ دلیل و برہان اور گفت وشنید کے بجائے دھونس، زبردستی، احتجاج اور بائیکاٹ کے طریقے اختیار کرتے ہیں، امن و صلح کے ماحول کے بجائے انھیں جنگ وجدل کی فضا زیادہ خوش گوار محسوس ہوتی ہے۔ دنیا آج مسلمانوں کو انھی حوالوں سے جانتی ہے۔ بلاشبہ اس میں پراپیگنڈے کا بھی کچھ دخل ہے لیکن مسلمانوں کو یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ ان اخلاقی جرائم کی بنیادیں پوری طرح ان کے اندر موجود ہیں۔

مسلمانوں کو اپنے اس تعارف کو تبدیل کرنا چاہیے، اور اگر وہ دنیا میں سیاسی اور معاشی عدل وانصاف کے قیام کے لیے کوئی کردار ادا کرنا چاہتے ہیں تو پھر ان کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ اجتماعی اخلاقی اقدار کو اپنی معاشرت، اپنی معیشت اور اپنی سیاست میں اس طرح جاگزیں کر لیں کہ اقوامِ عالم پکار اٹھیں کہ مسلمانوں سے زیادہ عادل، مسلمانوں سے زیادہ سچا، مسلمانوں سے زیادہ روادار اور مسلمانوں سے زیادہ حق پرست اس کرۂ ارض پر اور کوئی نہیں ہے۔

ایک اور پہلو سے اس سانحے کا پیغام امتِ مسلمہ کے لیے یہ ہے کہ وہ علم و ہنر کے میدان میں ایسی ترقی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حاصل کرلے کہ کسبِ فیض کے لیے لوگ اقصاے عالم سے اس کی طرف رجوع کریں۔ اس زمانے میں قومی فضیلت کی بنیاد اصلاً عسکری قوت، عددی اکثریت یا علاقائی وسعت نہیں ہے۔ اس کی بنیاد معیشت اور سائنس و ٹیکنالوجی کی قوت ہے۔ جو قوم ان دونوں اعتبارات سے زیادہ مضبوط ہے دنیا کی قیادت اسی کے پاس ہو گی۔ ان دونوں قوتوں کے حصول کا ایک ہی دروازہ ہے اور وہ دروازہ تعلیم ہے۔ بدقسمتی سے ایک مدت سے مسلمانوں نے اس دروازے کو تقریباً بند ہی کرر کھا ہے۔ ہمارے نوجوان احتجاج کرتے ہیں، سیاست کرتے ہیں، جہاد کرتے ہیں، یہ سب کچھ کرتے ہیں لیکن تعلیم و تحقیق اور نئ سے نئ دنیاؤں کی دریافت ان کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اگر کچھ نوجوانوں کی توجہ تعلیم کی طرف ہے بھی تو اس کا محرک روزگار کا حصول ہے۔ بہرحال موجودہ تمدن میں علم ہنر کی ترقی ہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر کوئی قوم عالم کی فرماں روائی کے منصب پر فائز ہو سکتی ہے۔

حادثے کا یہ پیغام سلطنتِ ارضی کے باجبروت شہنشاہوں کے لیے بھی ہے، اس کی محروم و مجبور رعایا کے لیے بھی ہے، اور اس میں عدل و قسط کی داعی جماعت، امت مسلمہ کے لیے بھی ہے۔ آنے والا زمانہ یہ بتادے گا کہ نفسا نفسی کے شور میں کس نے اس پیغام کو دھیان لگا کر سنا تھا۔

—— منظور الحسن

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(۲۰)

(گذشتہ سے پیوستہ)

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ط وَلِلْکٰفِرِیْنَ

(اِن[۲۵۴] کے فتنوں سے بچنے کے لیے)، اے ایمان والو، (تم بارگاہِ رسالت میں بیٹھو تو) 'راعنا'[۲۵۵] نہ کہا کرو، 'انظرنا'[۲۵۶] کہا کرو اور (جو کچھ کہا جائے، اُسے) توجہ سے سنو[۲۵۷]، اور

۲۵۴۔ یہ اب مسلمانوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے خلاف یہود کی اُن شرارتوں اور اعتراضات سے متنبہ کیا جارہا ہے جو وہ قرآن کی طرف سے اُن پر اتمامِ حجت کے ردِّ عمل میں اپنے دل کی بھڑاس نکالنے، حضور کی توہین کرنے اور مسلمانوں کی نگاہوں میں اپنے آپ کو گرانے کے لیے کرتے تھے۔

۲۵۵۔ 'راعنا' 'مراعاۃ' سے امر کا صیغہ ہے۔ اس کے لغوی معنی، ذرا ہماری رعایت فرمائیے، کے ہیں۔ بات اگر اچھی طرح سنی یا سمجھی نہ گئی ہو تو متکلم کو پھر متوجہ کرنے کے لیے عربی زبان میں یہ لفظ بالکل اسی موقع پر بولا جاتا ہے، جس موقع پر ہم اردو میں کہتے ہیں: ذرا پھر ارشاد فرمائیے۔ قرآن نے دوسری جگہ تصریح کی ہے کہ یہود اس لفظ کو زبان ذرا نیچے کی طرف دبا کر اس طرح ادا کرتے تھے کہ اس کے معنی بالکل تبدیل ہو جاتے اور اس سے اُن کا مقصود خدا کے دین اور اُس کے پیغمبر پر طنز کرنا اور پھبتی چست کرنا ہوتا۔ قرآن نے یہاں اسی بنا

عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۰۴﴾ مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِکِیْنَ اَنْ
یُّنَزَّلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ خَیْرٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ ط وَاللّٰهُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ
ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۱۰۵﴾
مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ط اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ

(اِس بات کو یاد رکھو کہ) اِن کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے[۲۵۸]۔ اہلِ کتاب ہوں یا مشرکین، اِن میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے، وہ نہیں چاہتے کہ تمھارے پروردگار کی طرف سے کوئی خیر تم پر نازل کیا جائے[۲۵۹]۔ اور (یہ احمق نہیں جانتے کہ) اللہ جس کو چاہتا ہے، اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیتا ہے، اور (نہیں جانتے کہ) اللہ بڑی عنایت فرمانے والا ہے۔۱۰۴-۱۰۵

(اِنھیں اعتراض ہے کہ تورات کی شریعت میں ہم کوئی تبدیلی کیوں کرتے ہیں۔ اِنھیں بتادو)،

پر اس لفظ کو مسلمانوں کے مجلسی آداب سے یک قلم خارج کر دیا اور اس کی جگہ ایک دوسرا لفظ 'انظرنا' استعمال کرنے کی ہدایت فرمائی جو عربی زبان میں اس موقع و محل کے لیے معروف تھا اور جس میں اس طرح کی تحریف کا بھی کوئی امکان نہ تھا۔

۲۵۶۔ اس کے لغوی معنی دیکھنے، مہلت دینے اور انتظار کرنے کے ہیں۔

۲۵۷۔ اصل میں لفظ 'اسمعوا' استعمال ہوا ہے۔ یہ اس آیت میں اپنے حقیقی مفہوم میں ہے، یعنی غور سے سنو اور سمجھو تاکہ تمھیں بار بار پیغمبر کو متوجہ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

۲۵۸۔ یعنی جانتے بوجھتے پیغمبر کو جھٹلانے پر مصر ان یہودیوں کے لیے جو مجلسِ نبوی میں نہ سننے کے لیے آتے ہیں اور نہ سمجھنے کے لیے، بلکہ صرف اس لیے آتے ہیں کہ پیغمبر کی توہین کا کوئی موقع پیدا کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالیں۔

۲۵۹۔ مطلب یہ ہے کہ مسئلہ صرف ایک لفظ کے استعمال کرنے اور نہ کرنے کا نہیں ہے، بلکہ یہودی اور یہ مشرکین، دونوں اس غصے اور حسد میں جل رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید اور پیغمبر کی صورت میں یہ خیرِ عظیم تمھیں کیوں عطا فرمایا ہے۔

عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَمَا
لَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیۡرٍ ﴿۱۰۷﴾

ہم (اِس کتاب کی) جو آیت بھی منسوخ کرتے ہیں[۲۶۰] یا اُسے بھلا دیتے ہیں[۲۶۱]، (قرآن میں) اُس کی جگہ اُس سے بہتر یا اُس جیسی کوئی دوسری لے آتے ہیں[۲۶۲]۔ کیا تم نہیں جانتے، (اے لوگو) کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے[۲۶۳]۔ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ آسمانوں اور زمین کی پادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور تمھارے لیے اللہ کے سوا کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مدد کرنے والا[۲۶۴]۔ ۱۰۶-۱۰۷

۲۶۰۔ یعنی شریعت کے ایک ضابطے کو ہٹا کر کوئی دوسرا ضابطہ مقرر کرتے ہیں۔

۲۶۱۔ اصل میں لفظ 'انساء' استعمال ہوا ہے۔ یعنی فراموش کرا دینا۔ اس سے قرآن نے تورات کے اُن احکام کی طرف اشارہ کیا ہے جن سے یہود نے بے پروائی برتی اور اُن کے اس جرم کی پاداش میں وہ اُن کے ذہنوں سے محو کر دیے گئے۔

۲۶۲۔ اصل الفاظ ہیں 'نات بخیر منھا او مثلھا' ان میں 'او' تقسیم کے لیے ہے۔ یعنی تورات کے وہ ضابطے جو منسوخ کر دیے گئے، تمدن کے ارتقا اور حالات کی تبدیلی کے پیشِ نظر اُن سے بہتر ضابطے دیتے ہیں اور جو بھلا دیے گئے، اُن کی جگہ انھی جیسے بعض دوسرے ضوابط نازل کر دیتے ہیں۔ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو قابلِ اعتراض قرار دی جا سکے۔ پہلی چیز حالات کے تغیر کا لازمی تقاضا ہے اور دوسری دین کی دولت کے اس ضیاع کا لازمی نتیجہ جو تمھارے ہاتھوں سے ہوا اور جس کے باعث ضروری تھا کہ اب دین کے خزانے کو نئی دولت سے معمور کیا جائے۔

۲۶۳۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہود کو شریعت دے کر اپنے اختیار اور اپنی قدرت سے دستبردار نہیں ہو بیٹھا۔ وہ جب چاہے گا اور جس ذریعے سے چاہے گا، اپنی شریعت دنیا کو دے گا اور اُس میں جو ترمیم و تغیر بھی ضروری ہو گا، اپنی حکمت کے مطابق کر دے گا۔

۲۶۴۔ یعنی خدا نے اپنی شریعت کا حامل بنا کر تمھیں جس منصب پر فائز کیا تھا، تم اگر اُس کے اہل ثابت نہیں ہو سکے اور اب اُس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تمھاری جگہ وہ کسی دوسری قوم کو اس منصب پر سرفراز فرمائے گا تو تمھارے غم و غصہ کے باوجود یہ فیصلہ نافذ ہو کر رہے گا۔ تمھارا کوئی حامی و مددگار بھی خدا کے اس فیصلے سے تمھیں نہیں بچا سکتا۔

[باقی]

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

ایمان سے محرومی کی نوعیت

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث: ۵۴-۵۷)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وفی روایة عباس رضی اللّٰہ عنه: و لا یقتل حین یقتل و ھو مؤمن. قال عکرمة رحمه اللّٰہ: قلت لإبن عباس: کیف ینزع الإیمان عنه؟ قال: ھکذا، و شبک بین أصابعه ثم أخرجھا. فإن تاب عاد إلیه ھکذا، و شبک بین أصابعه. و قال أبو عبد اللّٰہ:[1] لا یکون ھذا مؤمناً تاماً، ولا یکون له نور الإیمان.

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ جملہ بھی ہے کہ کوئی قتل نہیں کرتا اس طرح کہ جب وہ قتل کرتا ہے تو وہ مومن ہو۔ عکرمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: (جب میں نے ابنِ عباس سے یہ روایت سنی تو) میں نے پوچھا: اس سے ایمان کیسے نکال لیا جاتا ہے۔ انھوں نے جواب میں کہا: اس طرح، اور اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈالیں اور انھیں نکال لیا۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو اس طرح لوٹ آتا ہے، اور انگلیوں میں انگلیاں ڈال دیں۔ امام بخاری

ا۔ یہ امام بخاری رحمہ اللہ کی کنیت ہے۔

نے (اس بات کی توضیح کرتے ہوئے) کہا: یہ شخص پورا مومن نہیں ہوتا اور نہ اس کے لیے ایمان کی روشنی ہو گی۔''

لغوی مباحث

ینزع: 'نزع' کا مطلب کسی شے کو اس کی جگہ سے اکھیڑ دینا ہے۔

شبک بین أصابعه: یہ ترکیب اسی طرح بولی جاتی ہے اور اس کے معنی انگلیوں میں انگلیاں ڈالنے کے ہیں۔ 'شبک' کے معنی ایک شے کو دوسری شے میں ملانے کے ہیں۔ اسی سے لفظ 'شبکة' جال کے معنی میں آتا ہے۔

نور: لفظی معنی روشنی کے ہیں۔ موقعِ استعمال کے اعتبار سے نور عام طور پر اس روشنی کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں حدت نہ ہو۔ لیکن ہمارے ہاں اس کو ایک خاص مقدس روشنی کے معنی میں لیا جاتا ہے۔ درآنحالیکہ قرآنِ مجید میں اسے عام روشنی ہی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً دیکھیے، قرآنِ مجید میں ہے 'هو الذی جعل الشمس ضیاء و القمر نورا' (وہی ہے جس نے سورج کو تابانی اور چاند کو چمک بنا دیا)۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

متون

روایت کا اصل متن جس میں برائی کرتے ہوئے ایمان سے محرومی کا مضمون بیان ہوا ہے، حدیث: ۵۳ میں زیرِ بحث آ چکا ہے۔ وہ روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ یہ مضمون حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ لیکن اس میں قتل کی مثال والا جملہ زیادہ ہے۔ اگرچہ ابنِ عباس سے مروی ایک متن میں بھی صرف چوری اور زنا کا ذکر ہے اور باقی مثالیں بیان نہیں ہوئیں۔ مزید یہ کہ ابنِ عباس سے مروی کسی بھی متن میں 'نہبۃ' والی مثال روایت نہیں ہوئی۔ اس روایت کے تجزیے سے یہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے کہ روایت: ۵۳ ہی اس مضمون کی جامع روایت ہے۔ اگرچہ اس میں قتل کی مثال والا جملہ نہیں ہے۔ لیکن اس سے روایت کے مضمون میں کوئی قابلِ لحاظ فرق نہیں آتا، البتہ اس روایت کے آخر میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت عکرمہ رحمہ اللہ کا مکالمہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ مکالمہ حضرت ابنِ عباس کے علم و فہم کا آئینہ دار ہے۔

معنی

روایت کے اصل متن کے مفاہیم حدیث: ۵۳ کے تحت زیرِ بحث آ چکے ہیں۔ یہاں ہمارے پیشِ نظر

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی توضیح کی تفصیل ہے۔ حضرت ابنِ عباس نے ہاتھ کی انگلیوں کے ایک دوسرے میں جانے اور نکلنے کی عملی مثال سے ایمان کے آنے اور جانے کی وضاحت کی ہے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بات کو ایمان کے چھتری کی طرح اوپر معلق ہونے سے واضح کیا ہے۔ یہ دونوں باتیں اصل میں اس نکتے کو واضح کرتی ہیں کہ ایمان جب ہماری نفسیات میں ایک فعال عامل کی حیثیت سے کارفرما ہوتا ہے اس وقت ہم برائی کے ارتکاب سے بچے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن جب اسے فراموش کر دیتے ہیں تو یہ اپنا یہ کردار بھی ادا نہیں کرتا۔ فراموشی کی یہی حالت ہے جسے حضرت ابنِ عباس نے انگلیوں کی طرح باہم پیوست ہونے اور پھر الگ ہونے سے تشبیہ دی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علیحدگی کی نوعیت کو بندۂ مومن کے اوپر ایمان کے سایہ فگن ہونے سے واضح کیا ہے۔ حضرت ابنِ عباس نے بیان کیا ہے کہ یہ ایمان توبہ کرنے سے پہلے والی حالت میں لوٹ آتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ساتھ ساتھ رہنے کے پہلو کو واضح کر کے یہ بات بیان کر دی کہ اس دوری سے ایمان بالکل الگ نہیں ہو جاتا بلکہ پھر یہ توبہ وانابت کے انتظار میں پاس ہی موجود ہوتا ہے۔ ان پہلوؤں کو سامنے رکھیں تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت ابنِ عباس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مدعا کو صحیح سمجھا اور اسے اپنے مخاطب کو سمجھانے کے لیے بڑی خوب صورت تشبیہ سے واضح کر دیا۔ یہ بات قرآنِ مجید میں براہِ راست تو بیان نہیں ہوئی، لیکن سورۂ نساء کی آیت ۱۳۶ میں 'یاایھاالذین آمنوا آمنوا' (اے ایمان والو، ایمان لاؤ۔) کہہ کر یہ بات واضح کر دی ہے کہ بسا اوقات آدمی بظاہر اہلِ ایمان کی صف میں کھڑا ہوتا ہے لیکن وہ ایمان کی اصل سے محروم ہوتا ہے۔

کتابیات

ابنِ عباس سے مروی یہ روایت صرف بخاری اور نسائی نے لی ہے۔ بخاری، کتاب الحدود، باب ۶، باب ۲۰۔ نسائی، کتاب القسامہ، باب ۴۷۔

علاماتِ نفاق

و عن أبی هریرة قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: آیة المنافق ثلاث. زاد مسلم: إن صام و صلی و زعم أنه مسلم. ثم اتفقا:

إذا حدث كذب و إذا وعد أخلف و إذا أوتمن خان.

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: منافق کی تین نشانیاں ہیں۔ مسلم نے یہ جملہ بھی روایت کیا ہے کہ اگرچہ وہ نماز پڑھتا اور روزہ رکھتا ہو اور اس کا خیال ہو کہ وہ مسلمان ہے (اس کے باوجود اس میں نفاق کی یہ علامتیں ہو سکتی ہیں۔) پھر دونوں کی روایت کے الفاظ یکساں ہیں: جب بات کرتا ہے، جھوٹ بولتا ہے۔ جب وعدہ کرتا ہے، اسے پورا نہیں کرتا۔ اور جب اس کے پاس امانت رکھی جاتی ہے، اس میں خیانت کرتا ہے۔''

لغوی مباحث

آیة: نشانی، وہ شے جو کسی حقیقت تک پہنچنے کا باعث ہو۔

المنافق: 'نفاق' کے معنی ہیں، اپنے لیے دونوں راستے کھلے رکھنا۔ اسی سے یہ اس شخص کے لیے بھی آتا ہے جو دوگلے رویے کو اختیار کیے ہوئے ہو۔ اسلامی اصطلاح میں یہ وہ شخص ہے جو بظاہر کامل مؤمن بنا ہوا ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

زعم: مدعی ہونا، کسی بات کا حقیقت سے بڑھ کر اظہار کرنا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

متون

اس طرح کی روایات جن میں ایک بات کی وضاحت میں مختلف نکات بیان کیے گئے ہوں، راوی روایت کرتے ہوئے ترتیب بدل دیتے ہیں۔ چنانچہ اس روایت کے ساتھ بھی یہ معاملہ ہوا ہے۔ اسی طرح روایات کے مختلف متون میں ایک ہی بات کو بیان کرنے کے لیے ہم معنی الفاظ یا جملے آجاتے ہیں۔ یہ روایت بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ 'آیة المنافق ثلاث' کی جگہ ایک روایت میں 'من علامات المنافق ثلاثة' یا 'ثلاث من كن فيه' یا 'ثلاث فی المنافق' روایت ہوا ہے۔ مزید برآں جس طرح مسلم نے 'إن صام و صلی و زعم أنه مسلم' کا زائد جملہ روایت کیا ہے۔ اسی طرح ایک روایت میں روایت کو 'فمن كانت فيه واحدة منهن لم تزل له خصلة من النفاق حتى يتركها' (پھر جس میں ان میں سے کوئی (علامت) ہوئی تو اس میں نفاق کی ایک خصلت رہے گی الا یہ کہ وہ توبہ کر لے) کے جملے پر مکمل کیا گیا ہے۔ یہ اضافہ وہی ہے جو اس سے اگلی حدیث میں جس میں نفاق کی چار خصلتیں بیان ہوئی ہے روایت ہوا

ہے۔ کوئی ایک روایت ایسی نہیں ہے جس میں یہ تینوں اجزا یکجا ہو گئے ہوں۔ لہٰذا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ مختلف متون میں بکھرے ہوئے جملوں سے ایک مکمل روایت اخذ کی جائے۔

معنی

اس روایت کے معنی کی تعیین میں شارحین کو ایک مشکل درپیش ہے۔ منافق کا لفظ اس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو دل سے کافر ہو لیکن ظاہر میں مسلمان بنا ہوا ہو۔ یہ تینوں خصلتیں اپنی اصل میں کبیرہ گناہ ہیں۔ اگر کوئی شخص ان کا مرتکب ہو تو اسے وہ منافق قرار دینا سمجھ میں نہیں آتا جو بظاہر مسلمان ہے لیکن دل میں کفر چھپائے ہوئے ہے۔ چنانچہ وہ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے نفاق کی دو قسمیں متعین کرتے ہیں۔ ایک نفاق کا تعلق عقیدے سے ہے اور دوسرے نفاق کا تعلق عمل سے۔ لہٰذا وہ ان روایات کو عملی نفاق سے متعلق قرار دیتے ہیں۔ اور اس طرح لفظ منافقت کے اطلاق کی ایک صورت نکال لیتے ہیں۔

بعض شارحین اس روایت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے منافقین کے متعلق مانتے ہیں۔ ہماری رائے میں یہی رائے درست ہے۔ درحقیقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے کے منافقین کو متنبہ کرنے کے لیے ایک واضح بات کہہ دی ہے۔ آپ نے انھیں بتا دیا ہے کہ ان کے نماز روزے کی کوئی حقیقت نہیں ہے جب تک وہ اپنی منافقت سے توبہ نہیں کر لیتے۔ اور اہلِ اسلام کے ساتھ ان کے نفاق کا اظہار ان امور میں ہوتا جہاں انھیں اپنے اوپر عائد ہونے والی کسی ذمہ داری یا تقاضے کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ گویا آپ نے یہ واضح کر دیا کہ جو شخص نفاق سے توبہ کرتا ہے، اسے اپنے کردار میں نفاق کے ان عناصر سے اپنے آپ کو پاک کرنا ہو گا۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ قرآنِ مجید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے منافقین کا معاملہ بڑی تفصیل سے زیرِ بحث آیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ منافقین میں ایسے لوگ بھی شامل تھے، جو اپنے نفاق پر پورے طور پر متنبہ نہیں تھے۔ یہ روایت انھی منافقین کو اپنی اصلاح کا طریقہ بتاتی ہے۔ یعنی انھیں یہ تعلیم دیتی ہے کہ نماز روزے کے اہتمام کے ساتھ اگر ان امراض کا علاج کر لیا جائے تو آدمی نفاق کے فتنے سے بچ جاتا ہے۔ یہ اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ آپ کے مخاطبین کے لیے ایمان کے معاملے میں سچ بولنے، وعدے کی پاسداری اور امانت کی حفاظت کی کیا حیثیت تھی۔

اب ہم مسلمانوں کے لیے بھی یہ روایت ایک واضح تعلیم رکھتی ہے۔ ہم میں سے جو شخص ان بری خصلتوں میں مبتلا ہے، شدید اندیشہ ہے کہ وہ دین کے معاملے میں بھی اسی رویے کا مرتکب ہو گا۔ دین اعلانِ حق ہے،

دین ایک عہد ہے، دین ایک امانت ہے۔ جو شخص روز مرہ کی زندگی میں جھوٹ، بد عہدی اور خیانت کا مرتکب ہوتا ہے، وہ دین کے معاملے میں بھی انھی خصائل کا مظاہرے کرے گا۔ اور اگر ایسا ہوا اور قیامت کے دن وہ اسی حالت میں اللہ کے حضور میں پہنچا تو وہ منافق ہی قرار دیا جائے گا۔

اس روایت میں جن امور کا ذکر کیا گیا ہے، وہ دراصل ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ ہماری مراد مفاد پرستی کے بجائے سچائی اور عدل پر قائم ہونا ہے۔ یہ جرائم اسی وقت ہوتے ہیں جب آدمی کسی دنیوی مفاد کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے۔ یہود اور اوس و خزرج کے منافقین دین کے معاملے میں اسی مفاد پرستی کا شکار ہو گئے تھے۔

کتابیات

بخاری، کتاب الایمان، باب ۲۳۔ کتاب الشہادات، باب ۲۸۔ کتاب الوصایا، باب ۸ کتاب الادب، باب ۶۹۔ مسلم، کتاب الایمان، باب ۲۵۔ ترمذی، کتاب الایمان، باب ۱۳۔ نسائی، کتاب الایمان، باب ۲۰۔ احمد، مسند ابی ہریرۃ۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

منافقت کی نشانیاں

و عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: أربع من كن فيه كان منافقا خالصا، ومن كانت خصلة منهن كانت خصلة من النفاق حتى يدعها: إذا اؤتمن خان، وإذا حدث كذب، و إذا عاهد غدر و إذا عاصم فجر.

"حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ چار (خصلتیں) جس میں ہوتی ہیں وہ پکا منافق ہوتا ہے۔ اور جس میں ان میں سے ایک خصلت ہوتی ہے اس میں ایک نفاق کی خصلت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے: جب اس کے پاس امانت رکھی جاتی ہے، خیانت کرتا ہے۔ جب بات بیان کرتا ہے، جھوٹ کہتا ہے۔ جب عہد کرتا ہے اسے، وفا نہیں کرتا۔ جب کسی سے ان بن ہو جاتی ہے، حد سے باہر نکل جاتا

ہے۔''

لغوی مباحث

خصلة: عادت، انسانی کردار کے اچھے اور برے پہلوؤں کے لیے بولا جاتا ہے۔

غدر : بے وفائی کرنا۔ طے شدہ امور سے منحرف ہو جانا۔

خاصم : جھگڑا کرنا۔

متون

اس روایت کے متون میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ کچھ لفظی تفاوت ہیں۔ مثلاً ایک روایت میں 'منافقاً خالصاً' کی جگہ صرف 'منافقاً' ہے۔ اگلے جملے میں زیرِ بحث روایت میں 'منهن' ہے۔ جبکہ ایک روایت میں اس کے بجائے 'من اربعة' آیا ہے۔ اس روایت کے اکثر متون میں 'خصلة' کا لفظ آیا ہے، لیکن بعض راوی اس کا ہم معنی لفظ 'خلة' استعمال کرتے ہیں۔ ایک فرق البتہ کافی اہم ہے۔ زیرِ بحث متن میں چار علامتوں میں سے ایک، امانت میں خیانت ہے۔ یہ روایت بخاری میں ہے اور بخاری نے بھی اسے ان چار علامتوں کے ساتھ ایک ہی جگہ درج کیا ہے۔ اس کے علاوہ بخاری اور دوسری کتابوں میں اس روایت کا جو متن روایت ہوا ہے اس میں 'إذا اؤتمن خان' کے بجائے 'إذا وعد أخلف' کا جملہ ہے۔ اس طرح ان متون میں 'إذا وعد أخلف' اور 'عاهد غدر' جیسے ہم معنی دو جملے یکجا ہو گئے ہیں۔ اگرچہ وعدے اور معاہدے میں ایک لطیف فرق ہے۔ لیکن اس روایت کے سیاق و سباق میں اس کی کچھ اہمیت نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک صاحبِ مشکوٰۃ کا منتخب متن ہی درست ہے۔

معنی

اس سے پہلی روایت اسی مضمون کی حامل ہے۔ وہاں ہم اس کے مفہوم کو موقع و محل کی روشنی میں واضح کر چکے ہیں۔ اوپر والی روایت میں تین نشانیاں بتائی گئی ہیں اور اس روایت میں چار بیان ہوئی ہیں۔ یہ چوتھی نشانی جھگڑے میں حد سے تجاوز ہے۔ بظاہر یہ نشانی ان نشانیوں کی قبیل کی نہیں ہے جو اس کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ وہ نشانیاں کردار میں استقلال واستقامت کی نفی پر دلالت کرتی ہیں۔ جبکہ یہ صرف اس کمزوری کو بیان کرتی ہے کہ آدمی اختلاف کے موقع پر اپنے اشتعال پر قابو نہیں رکھتا۔ لیکن اگر اسے حضور کے زمانے کے منافقین سے

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

متعلق مانا جائے تو یہ ان کے کردار کے اور پہلو کو واضح کرتی ہے۔ جب کوئی آدمی اپنے اندر سے اور باہر سے اور ہو تو اسے اپنے آپ کو سچاد کھانے کے لیے عجیب و غریب طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ ان میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے نقطہ ء نظر کے ساتھ اپنے جذباتی لگاؤ کا مظاہرہ کرے۔ گویا وہ اپنے نقطہ ء نظر کے معاملے میں اتنا سچا ہے کہ اس کے خلاف کسی شے کو گوارا نہیں کر سکتا۔ وہ اس کی خاطر ہر ایک سے جھگڑا مول لیتا ہے اور اسے اس قدر ٹھیس پہنچی ہے کہ اس کے لیے آداب کا لحاظ ممکن نہیں۔

کتابیات

بخاری، کتاب الایمان، باب ۲۳۔ کتاب المظالم، باب ۱۷۔ کتاب الجزیہ، باب ۱۷۔ مسلم، کتاب الایمان، باب ۲۵۔ ترمذی، کتاب الایمان، باب ۱۳۔ نسائی، کتاب الایمان، باب ۲۰۔ ابو داؤد، کتاب السنۃ، باب ۱۶۔ احمد، مسند عبداللہ بن عمرو۔

منافق کی مثال

و عن ابن عمر رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: مثل المنافق كالشاة العائرة بين الغنمين تعير إلى هذه مرة و إلى هذه مرة.

"حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: منافق کی مثال دو گلوں کے درمیان سر گرداں بکری کی ہے۔ کبھی وہ ایک کی طرف آتی ہے اور کبھی دوسرے کی طرف۔"

لغوی مباحث

العائرۃ: سر گرداں، یعنی جو اپنے راستے اور منزل کے بارے میں متعین نہ ہو۔

متون

اس روایت کو مسلم کے علاوہ نسائی، دارمی اور احمد نے روایت کیا ہے۔ ان متون میں ایک فرق تو یہ ہے کہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ایک متن میں 'تعیر' کی جگہ 'تکر' کا لفظ آیا ہے۔ غالباً یہ فرق مسودے کے پڑھنے میں واقع ہو گیا ہے۔ ورنہ روایت کے جملوں میں موزوں ترین لفظ 'تعیر' ہی ہے۔ اسی طرح بعض متون میں روایت اسی جملے پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کے بعد یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ 'لا تدری ایھما تتبع' یا 'لا تدری أ ھذہ تتبع أھذہ' (وہ نہیں جانتی اس کے پیچھے جائے یا اس کے پیچھے)۔ یہ اضافہ درست معلوم ہوتا ہے۔ اس سے منافق کی نفسیاتی کیفیت پر تبصرہ مکمل ہو جاتا ہے۔

معنی

یہ روایات انھی منافقین کے بارے میں ہیں جو محض ظاہری طور پر ایمان قبول کیے ہوئے ہیں۔ یہ رویہ وہ اپنے دنیوی مفادات کی حفاظت کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ ان کے بعض مفادات کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ اہلِ کفر کے ساتھ وابستہ رہیں اور کچھ مفادات کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ اہلِ اسلام کو بھی اپنی حق پرستی کا یقین دلائیں۔ چنانچہ عملاً وہ کبھی ان کے ساتھ چلتے دکھائی دیتے ہیں اور کبھی ان کے ساتھ۔ ان کی اس حالت کو ''شاۃ عائرہ'' سے تشبیہ دی گئی ہے۔

کسی چراہ گاہ میں جس میں دو ریوڑ چر رہے ہوں، یہ کیفیت اس بکری کی ہوتی ہے جو شہوت کے غلبے کے تحت کبھی ایک ریوڑ کے فحل کی طرف آتی اور کبھی دوسرے ریوڑ کے فحل کی جانب بڑھتی ہے۔ ظاہر ہے یہ بکریوں کی عام جبلت کے برعکس رویہ ہے۔ اسی طرح منافقت بھی اپنی اصل میں فطرت سے انحراف ہے۔ جس طرح بکری اپنے ریوڑ کے ساتھ اپنی نسبت سے محروم ہو جاتی ہے اسی طرح منافق بھی اپنی فطرت کی صالحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔

ہمارے نزدیک اس روایت سے یہ بات مؤکد ہو جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشِ نظر اپنے زمانے کے منافقین ہی ہیں۔

کتابیات

مسلم، کتاب صفات المنافقین واحکامھم، باب ۱۔ نسائی، کتاب الایمان وشرائعہ، باب ۳۳۔ دارمی، مقدمہ، باب ۳۱۔ احمد، مسند عبداللہ بن عمر۔

میزان

جاوید احمد غامدی

آداب و شعائر

(۳)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۵۔ میت کا غسل

یہ غسل بھی انبیا علیہم السلام کے سنن میں سے ہے[۱۰]۔ اس کا تقاضا اگرچہ بدن پر اچھی طرح پانی بہا دینے سے ہی پورا ہو جاتا ہے، لیکن دین میں تزکیہ و تطہیر کی جو اہمیت ہے، اس کے پیشِ نظر میت کو، جس حد تک ممکن ہو، پورے اہتمام کے ساتھ غسل دینا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر جو ہدایات اس کے لیے دی ہیں، وہ یہ ہیں:

اغسلنها ثلاثا او خمساً او اكثر من ذلك ان رأيتن ذلك بماء وسدر، واجعلن فی الآخرة كافوراً او شئياً من كافور. (بخاری، کتاب الجنائز)

"اس (بچی) کو تین مرتبہ یا پانچ مرتبہ یا اگر مناسب سمجھو تو اس سے بھی زیادہ مرتبہ پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ غسل دو اور آخری مرتبہ کے غسل میں کافور یا فرمایا کہ کچھ کافور بھی

۱۰۔ عام حالات میں یہ ہر مسلمان کو دینا ضروری ہے، لیکن کسی غیر معمولی صورتِ حال میں اگر میت کا غسل اور اس کی تجہیز و تکفین باعثِ زحمت ہو جائے تو اسے غسل اور تجہیز و تکفین کے بغیر بھی دفن کیا جا سکتا ہے۔ بخاری، کتاب الجنائز میں ہے کہ احد کے شہدا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح دفن کر دینے کی ہدایت فرمائی تھی۔ یہ واقعہ حدیث کی بعض دوسری کتابوں میں بھی بیان ہوا ہے۔ ہمارے فقہا نے اسے شہادت کی موت سے متعلق قرار دیا ہے، درآں حالیکہ یہ ایک عام استثنا ہے جو دین میں رخصت کے اسی اصول پر مبنی ہے جو اس کے تمام احکام میں ملحوظ ہے۔

پانی میں شامل کر لو۔''

اغسلنها وتراً: ثلاثا او خمساً او سبعاً، و ابدأن بميامنها و مواضع الصلوٰة منها. (بخاری، کتاب الجنائز)

''اس (بچی) کو طاق عدد میں غسل دو: تین یا پانچ یا سات مرتبہ اور دائیں سے شروع کرو اور اُن اعضا سے جن پر وضو کیا جاتا ہے۔''

۱۶۔ تجہیز و تکفین

غسل کے بعد میت کو کفن دینا بھی دینِ ابراہیمی کی سنت ہے۔ یہ اگرچہ کپڑے کی ایک چادر بھی ہو سکتی ہے جو اسے پہنا دی جائے، لیکن میت کے اکرام کا تقاضا ہے کہ اس میں بھی اہتمام کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ ام المومنین سیدہ عائشہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سوتی کپڑے کی تین یمنی چادروں کا کفن پہنایا گیا جن میں کوئی قمیص یا عمامہ نہیں تھا[11]۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے:

اذا كفن احدكم اخاه فليحسن كفنه. (مسلم، کتاب الجنائز)

''تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کفن دے تو اسے اچھا کفن دینا چاہیے۔''

۱۷۔ تدفین

میت کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے انبیا علیہم السلام کے دین میں اسے زمین میں قبر بنا کر دفن کیا جاتا ہے[12]۔ اس کا کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں کیا گیا سیدھا گڑھا کھود کر اس پر چھت ڈال دی جائے، اس کے پہلو میں شگاف بنا کر مردے کو اس میں لٹا دیا جائے یا تابوت میں ڈال کر سپردِ خاک کیا جائے، یہ سب طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے، البتہ قبر پختہ بنانے، اس پر کوئی عمارت تعمیر کرنے یا اس پر کچھ لکھنے کو پسند نہیں فرمایا[13]۔ بعض روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ تدفین کے موقع پر آپ نے سرہانے کی طرف سے تین مرتبہ قبر پر مٹی ڈالی[14]۔ یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ میت کو قبر میں اتارتے وقت آپ فرماتے تھے: 'بسم

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

۱۱۔ بخاری، کتاب الجنائز، باب ۲۳۔

۱۲۔ یہ طریقہ بھی عام حالات کے لیے ہے۔ چنانچہ اگر بحری جہاز یا کشتی میں موت واقع ہو جائے اور ساحل تک پہنچنے میں تاخیر کا اندیشہ ہو تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ میت کو پانی میں بہا دیا جائے۔

۱۳۔ مسلم، کتاب الجنائز، ح ۹۴: ابنِ ماجہ، کتاب الجنائز، باب ۴۳۔

۱۴۔ ابنِ ماجہ، کتاب الجنائز، باب ۴۴۔

اللہ وعلی سنۃ رسول اللہ'[15]۔احمد بن حنبل کی روایت ہے کہ یہی بات آپ نے اس موقع پر دوسروں کو بھی کہنے کی ہدایت فرمائی[16]۔تدفین کے بعد میت کے لیے دعا کی ہدایت بھی روایتوں میں بیان ہوئی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

استغفروا لاخیکم، وسلوا له بالتثبیت، فانه الان یسئل.
(ابوداؤد، کتاب الجنائز)

''اپنے بھائی کے لیے مغفرت کی دعا کرو اور ثابت قدمی کی درخواست کرو، اس لیے کہ اب اس سے پوچھا جائے گا۔''

(باقی)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۵۔ ''اللہ کے نام سے اور اس کے رسول کے طریقے پر''، ابوداؤد، کتاب الجنائز، باب ۶۹۔

۱۶۔ المسند، ج ۲، ص ۲۷، ۴۰، ۵۹، ۶۹۔

محمد رفیع مفتی

تصویر

— ۴ —

تصاویر کے بارے میں فہمِ صحابہ

ذخیرۂ احادیث کو اس حوالے سے دیکھا جائے تو تصاویر کے بارے میں فہمِ صحابہ سے متعلق تین بنیادی اور اہم روایتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔اِن روایتوں میں سے دو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں، یہ دونوں روایات صحیح بخاری کی ہیں اور فنی اعتبار سے صحیح روایات میں شمار کی جاتی ہیں۔ البتہ اِن میں سے ایک سند کے اعتبار سے دوسری کی نسبت زیادہ قوی ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ دونوں روایتیں باوجود ایک ہی صحابی سے مروی ہونے کے متضاد محسوس ہوتی ہیں۔ تیسری روایت لیث رحمہ اللہ سے مروی ہے،اِس کی سند کے سب راوی بھی ثقہ ہیں، لیکن اُن میں سے دو راویوں کی ثقاہت کے ساتھ ساتھ اُن کے حافظے میں بھی کلام پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس حدیث کو ہم بناے بحث بنانے کے بجائے صرف تائیدی طور پر ہی لائیں گے۔ لیث رحمہ اللہ نے اپنی اس روایت میں سالم رضی اللہ عنہ بن عبد اللہ کا ایک قول نقل کیا ہے، یہ قول ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی اُس روایت سے بالکل ہم آہنگ ہے، جو سند کے اعتبار سے نسبتاً قوی ہے۔

تصاویر کے بارے میں فہمِ صحابہ رضی اللہ عنہ کو جاننے کے لیے ہم یہ ترتیب قائم کرتے ہیں کہ پہلے ہم اِبنِ عباس کی اُس روایت کا مطالعہ کریں گے جو سنداً باقی روایات سے قوی ہے پھر اِس کے ساتھ ہی اُس تائیدی روایت کو دیکھتے ہیں، جس کے رواۃ پر حفظ کے پہلو سے کچھ جرح ہے اور آخر پر ہم ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی اُس روایت کو لائیں گے جو پہلی روایت کی نسبت سے قوت میں کمتر ہے۔

ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی وہ روایت جو سنداً زیادہ قوی ہے اور لیث رحمہ اللہ کی وہ روایت جو مفہوم کے

اعتبار سے اُس کی تائید کرتی ہے، یہ دونوں درجِ ذیل ہیں:

قال ابن عباس أخبرني أبو طَلْحَةَ رَضِي اللّٰهُ عَنْهُ ... صَاحِبُ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ قَدْ شَهِدَ بَدْرًا مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ...: أَنَّهُ قَالَ لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ، وَلَا صُورَةٌ، يُرِيدُ: التَّمَاثِيلَ الَّتِي فِيهَا الْأَرْوَاحُ.

(بخاری، المغازی، شہود الملائکہ بدرا)

''ابنِ عباس کہتے ہیں کہ مجھے ابو طلحہ رضی اللہ عنہ صحابی رسول جو کہ جنگ ِبدر میں بھی موجود تھے، انہوں نے بتایا تھا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ جس گھر میں کتا یا تصویر ہو، اس گھر میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔ (ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ) یہاں تصویر سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مراد وہ تماثیل تھیں ، جن تماثیل میں ارواح ہوتی ہیں۔''

حَدَّثَنَا لَيْثٌ قَالَ دَخَلْتُ عَلَى سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ وَهُوَ مُتَّكِئٌ عَلَى وِسَادَةٍ فِيهَا تَمَاثِيلُ طَيْرٍ وَوَحْش فَقُلْتُ أَلَيْسَ يُكْرَهُ هَذَا قَالَ لَا إِنَّمَا يُكْرَهُ مَا نُصِبَ نَصْبًا.

(مسندِ احمد، مسند المکثرین من الصحابہ)

''لیث رحمہ اللہ نے ہم سے بیان کیا کہ وہ سالم بن عبداللہ کے پاس گئے، جبکہ وہ (سالم) ایک ایسے تکیے سے ٹیک لگائے ہوئے تھے، جس پر پرندوں اور وحشی جانوروں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ وہ کہتے ہیں میں نے پوچھا کہ کیا (تکیے وغیرہ پر) ایسی تصاویر (کا ہونا) مکروہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا نہیں مکروہ تو بس وہ تصاویر ہیں ، جو استھانوں پر نصب کی جاتی ہیں۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ویسے تو اِن روایتوں میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ الفاظ بھی موجود ہیں، جو ہم نے بعض دوسری احادیث میں دیکھے ہیں اور اُن پر ہم پیچھے بحث کر چکے ہیں، لیکن اِن احادیث میں نئی بات صحابہ ء کرام کا تصویر کے بارے میں وہ فہم ہے، جو ہم جاننا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہم اِس فہمِ صحابہ رضی اللہ عنہم ہی کے حوالے سے اِن روایات کا مطالعہ کریں گے۔ اِن دو روایات سے ہمیں درجِ ذیل نکات معلوم ہوتے ہیں:

ا۔ پہلی روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول ''لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ، وَلَا صُورَةٌ'' کے بارے میں ابنِ عباس رضی اللہ عنہ ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ اِس میں ''صُورَةٌ'' کے لفظ سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مراد

اُن تماثیل سے تھی جن میں ارواح ہوتی ہیں۔

۲۔ دوسری روایت میں سالم رضی اللہ عنہ بن عبداللہ ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ وہ تماثیل جن کی موجودگی سے کسی شے کا استعمال مکروہ قرار پاتا ہے، وہ پرندوں اور جنگلی جانوروں وغیرہ کی تماثیل نہیں ہیں، بلکہ وہ وہ تماثیل ہیں (خواہ وہ کسی بھی شے کی ہوں) جو استھانوں پر نصب کی جاتی ہیں۔

اِن روایات سے تصویر کے بارے میں فہمِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے حوالے سے جو حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ تماثیل (تصاویر و مجسمے) جن کی موجودگی میں فرشتے گھر میں داخل نہیں ہوتے، اُن سے مراد عام تماثیل نہیں ہیں، بلکہ یہ وہ تماثیل ہیں جن میں ارواح ہوتی ہیں، یعنی جو تماثیل بجائے خود زندہ خیال کی جاتی ہیں۔ جیسے کہ مشرکینِ مکہ لات، عزیٰ، منات اور دوسرے دیوی دیوتاؤں کی تماثیل کو زندہ خیال کرتے تھے۔ ظاہر ہے، جبھی تو وہ اُن کو حاجت روا سمجھتے، اُن سے دعائیں مانگا کرتے اور آخرت میں اُن کی شفاعت کی توقع رکھتے تھے۔ یہ بات ہمیں ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی درجِ بالا حدیث سے معلوم ہوتی ہے۔ اب دیکھیے سالم بن عبداللہ کی حدیث سے بالکل یہی بات ایک اور طریقے سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ تماثیل جو اگر کسی کپڑے وغیرہ پر بنا دی جائیں، تو اُس کپڑے کا استعمال مکروہ ہو جاتا ہے، وہ (عام) پرندوں اور وحشی جانوروں کی تماثیل نہیں ہیں، بلکہ وہ، وہ تماثیل ہیں، جو استھانوں پر (دعا اور عبادت کی غرض سے) نصب کی جاتی ہیں۔ دیکھیے، یہ ٹھیک وہی تماثیل ہیں، جن میں ارواح کا موجود ہونا مانا جاتا اور جنھیں زندہ خیال کیا جاتا ہے۔

اب ہم تیسری روایت کی طرف آتے ہیں، جس کا مفہوم درجِ بالا دونوں روایتوں سے مختلف محسوس ہوتا ہے۔ یہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے اور یہ پہلی روایت کی نسبت سے صحت میں کمتر ہے۔ اِس روایت کے بارے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ یہ وہی روایت ہے، جس کے الفاظ سے ہمارے ہاں بہت بڑے پیمانے پر یہ سمجھ لیا گیا کہ اِس میں ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے ہمیں اسلام میں تصویر کی حلت و حرمت کا اصول بتا دیا ہے، یعنی یہ کہ تصویر اگر بے جان شے کی ہو تو حلال اور جان دار کی ہو تو حرام۔ چنانچہ تصویر کے بارے میں اصلاً، اسی روایت کی بنیاد پر وہ نقطۂ نظر وجود میں آیا، جسے علما و فقہا کی اکثریت نے اپنا لیا۔ لٰہذا یہ ضروری ہے کہ اِس روایت کا بہت دقتِ نظر کے ساتھ تجزیاتی مطالعہ کیا جائے۔ روایت درجِ ذیل ہے:

عَنْ سَعِيدِ بْنِ أَبِي الْحَسَنِ قَالَ كُنْتُ	''سعید بن ابی الحسن سے روایت ہے، وہ کہتے

عِنْدَ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِي اللّٰهُ عَنْهُمَا إِذْ أَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ يَا أَبَا عَبَّاسٍ إِنِّي إِنْسَانٌ إِنَّمَا مَعِيشَتِي مِنْ صَنْعَةِ يَدِي وَإِنِّي أَصْنَعُ هَذِهِ التَّصَاوِيرَ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ لَا أُحَدِّثُكَ إِلَّا مَا سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ سَمِعْتُهُ يَقُولُ مَنْ صَوَّرَ صُورَةً فَإِنَّ اللّٰهَ مُعَذِّبُهُ حَتَّى يَنْفُخَ فِيهَا الرُّوحَ وَلَيْسَ بِنَافِخٍ فِيهَا أَبَدًا فَرَبَا الرَّجُلُ رَبْوَةً شَدِيدَةً وَاصْفَرَّ وَجْهُهُ فَقَالَ وَيْحَكَ إِنْ أَبَيْتَ إِلَّا أَنْ تَصْنَعَ فَعَلَيْكَ بِهَذَا الشَّجَرِ كُلِّ شَيْءٍ لَيْسَ فِيهِ رُوحٌ.(بخاری، البیوع، بیع التصاویر)

ہیں، میں ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا تھا کہ اچانک آپ کے پاس ایک آدمی آیا، تو اس نے کہا اے ابنِ عباس رضی اللہ عنہ، میں ایک ایسا آدمی ہوں، جسے بس اپنے ہاتھ کے ہنر ہی سے روزی کمانی ہے۔اور میں یہ (خاص) تصاویر بناتا ہوں۔ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اِس ضمن میں تم سے وہی بیان کرتا ہوں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے۔میں نے آپ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے، جس نے کوئی تصویر بنائی، اللہ تعالیٰ اُس کو لازماً عذاب دے گا۔ یہاں تک کہ (سزا کے طور پر) اُس سے کہا جائے گا کہ اِس تصویر میں روح پھونکو، (وہ اُس میں روح پھونکنے کی کوشش کرے گا) لیکن وہ اس میں کبھی بھی روح نہ پھونک سکے گا۔وہ شخص یہ سن کر دم بخود رہ گیا اور اُس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے (یہ دیکھ کر) کہا، تیرا ناس ہو، اگر تجھے ضرور تصویر بنانی ہے، تو تُو اِس درخت کی بنا لے، تصویر بس اُسی چیز کی بنایا کر، جس میں روح نہیں ہوتی۔''

اِس روایت میں بیان کردہ اہم نکات یہ ہیں:

۱۔سائل کا پیشہ کوئی خاص نوعیت کی تصاویر بنانا تھا، جسے اس نے ''إِنِّي أَصْنَعُ هَذِهِ التَّصَاوِيرَ ''(میں یہ تصاویر بناتا ہوں) کے الفاظ سے بیان کیا۔

۲۔ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سائل کے جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ جس نے کوئی تصویر بنائی، اللہ تعالیٰ اُس کو لازماً عذاب دے گا، یہاں تک کہ (سزا کے طور پر) اُس سے کہا جائے گا کہ اِس تصویر

میں روح پھونکو، (وہ اُس میں روح پھونکنے کی کوشش کرے گا) لیکن وہ اس میں کبھی بھی روح نہ پھونک سکے گا۔

۳۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے سائل کو یہ مشورہ دیا کہ اگر تُو تصاویر بنا کر ہی روزی کمانے پر مجبور ہے، تو تُو بس اُسی چیز کی تصویر بنایا کر جس میں روح نہیں ہوتی، مثلاً اِس درخت کی تصویر بنالو۔

روایت کا رائج مفہوم

ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی اِس روایت کا صحیح مفہوم کیا ہے، یہ معلوم کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ ہم یہ دیکھ لیں کہ اِس روایت سے وہ استدلال کیسے کیا گیا ہے، جس کی بنا پر ہمارے ہاں بہت بڑے پیمانے پر یہ مسلک رائج ہو گیا کہ جان دار کی تصویر بنانا حرام ہے اور بے جان شے کی تصویر بنانا حلال ہے اور اِس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھ لیں کہ اس استدلال میں غلطی کیا ہے۔ اِس کے بعد ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ اِس روایت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟

اس نقطۂ نظر کے حاملین اپنا استدلال کچھ اس طرح سے پیش کرتے ہیں کہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے سائل کو یہ اصولی بات بتائی تھی کہ قیامت کے دن مصورین کو تصاویر میں روح پھونکنے کی سزا دینے کی وجہ یہ ہو گی کہ اُنھوں نے دنیا میں روح والی اشیا کی تصاویر بنائی ہوں گی۔ اگر اُنھوں نے روح والی اشیا کی تصاویر نہ بنائی ہوتیں، تو اُنھیں اپنی بنائی ہوئی تصاویر میں روح پھونکنے کا عذاب ہر گز نہ دیا جاتا۔ چنانچہ اس نقطۂ نظر کے حاملین کے خیال کے مطابق، محض اسی بنا پر ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے سائل کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اگر تجھے ضرور تصاویر بنانی ہیں، تو پھر غیر جان دار اشیا کی تصاویر بنایا کرو، اس صورت میں تم مذکورہ بالا عذاب سے بچ جاؤ گے۔

رہا یہ مسئلہ کہ جان دار اشیا ہی کی تصاویر کیوں ممنوع ہیں، تو اِس کے لیے وہ وہی روایت پیش کرتے ہیں، جس میں اللہ تعالیٰ نے تصویر بنانے والے کا جرم ''یخلق خلقاً کخلقی'' (میرے تخلیق کرنے کی طرح تخلیق کرنا) قرار دیا ہے، کیونکہ اُن کے خیال میں جان دار شے کی تصویر بنانا، خدا کی تخلیق ہی کی مثل تخلیق کرنا ہے اور بے جان شے کی تصویر بنانا خدا کی تخلیق کی مثل تخلیق کرنا نہیں ہے۔

رائج مفہوم پر تنقید

اِس اِستدلال میں کیا کمزوری ہے اور اِس رائے میں کیا سقم ہے، اِس پر پچھلے صفحات میں مفصل بحث ہو چکی ہے، یہاں آپ اِس روایت پر ایک دوسرے پہلو سے غور کریں۔ آپ دیکھیں اِس میں ابنِ عباس رضی اللہ عنہ تصویر کی حلت و حرمت کے حوالے سے کوئی اصول بیان کر ہی نہیں رہے۔ آپ اِس میں ایک فتویٰ تو ضرور

دے رہے ہیں اور سائل کو اُس کی مجبوری کا حل تو بتا رہے ہیں، لیکن اِس میں آپ تصویر کی حلت و حرمت کے حوالے سے کسی قسم کا کوئی اصول بیان نہیں کر رہے۔ چنانچہ یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اسلام میں تصویر کی حرمت کی وجہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے، یہ روایت اِس کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ اِس میں ابنِ عباس رضی اللہ عنہ ایک سائل کو اُس کی صورتِ حال دیکھ کر، اپنے خیال میں اُس کے لیے ایک قابلِ عمل راستہ بتا رہے ہیں۔ اِس روایت میں تصویر کی حرمت کی کوئی علت یا کوئی اصول تو بیان ہوا ہی نہیں۔ چنانچہ ہم براہِ راست اِس سے کوئی علت یا کوئی اصول تو ہرگز اخذ نہیں کر سکتے۔ رہا یہ مسئلہ کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے بیان کردہ اِس مشورے سے کوئی اصول ہم خود اخذ کر لیں، تو گذارش یہ ہے کہ ہم اِس سے کوئی اصول کیسے اخذ کر سکتے ہیں، ہمارے سامنے تو سائل کی فراہم کردہ معلومات پوری طرح سے واضح ہی نہیں ہیں۔ اِس روایت میں اُس نے ''ہذہ التصاویر'' (یہ تصاویر) کے اہم الفاظ بولے ہیں۔ یہ الفاظ سامنے کے اُس مخاطب (ابنِ عباس رضی اللہ عنہ) کے لیے، جو اسمِ اشارہ ''ھذہ'' کے مشارٌ الیہ ''التصاویر'' کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اُن کے لیے تو بالکل واضح ہیں، لیکن غائب (Third Person) کے لیے یہ الفاظ بالکل غیر واضح ہیں۔ چنانچہ ہمیں اِن الفاظ سے یہ پتا نہیں چلتا کہ وہ تصاویر جو یہ سائل بنایا کرتا تھا، وہ کس نوعیت کی تھیں۔ جب تک یہ بنیادی بات واضح نہ ہو، کم از کم اس حدیث کی بنیاد پر تو یہ قیاس بالکل نہیں کیا جا سکتا کہ ابنِ عباس نے سائل کو بس فلاں علت ہی کی بنا پر تصاویر بنانے سے منع کیا تھا۔ ایسی صورت میں ہم ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا ذہن کیسے جان سکتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے ممکن ہی نہیں۔

چنانچہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے اِس مشورے سے تصویر کی حرمت کی علت دریافت کرنا کسی صورت میں بھی درست نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ اُنھوں نے اُس میں علت کی حیثیت سے کوئی بات بیان ہی نہیں کی۔

مزید بات یہ ہے کہ اِس روایت کی مدد سے ''یخلق خلقاً کخلقی'' (میرے تخلیق کرنے کی طرح تخلیق کرنا) کے الفاظ کا جو مفہوم طے کرنے کی کوشش کی گئی ہے، وہ بھی درست نہیں۔ یہ کوشش تبھی درست ہو سکتی تھی جب کہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ اس روایت میں تصویر کی حرمت کی علت بیان کر رہے ہوتے، اگر ایسا ہوتا تو ہم یہ کہہ سکتے تھے کہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے ''یخلق خلقاً کخلقی'' کے اجمال کی جو تفصیل تھی وہ بیان کر دی ہے۔ لہٰذا، ''یخلق خلقاً کخلقی'' کا مفہوم اِس روایت سے طے کرنا بجائے خود غلط ہے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

پھر مشکل یہ ہے کہ تصویر کی حرمت کی یہ علت (یعنی جان دار کی تصویر ہونا) جو درجِ بالا رائے کے مویدین نے بیان کی ہے، اِسے اگر مان لیا جائے، تو پھر صلیب کی تصاویر تو بالکل جائز قرار پاتی ہیں، حالانکہ احادیث میں ہم یہ بات دیکھ چکے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صلیب کی تصویر کو ہرگز گوارا نہیں کرتے تھے۔ آپ اُس شے کو جس پر صلیب بنی ہوتی تھی، توڑ دیتے تھے اور اگر وہ کوئی کپڑا ہوتا، تو اُسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پھاڑ دیتے تھے۔ دوسری عجیب اور بالکل ناقابلِ فہم بات جو اِس رائے کو اختیار کرتے ہوئے ماننی پڑتی ہے، وہ یہ ہے کہ روح والی شے کی تصویر بنانا تو خدا کی تخلیق کی نقالی کرنا ہے اور بے روح یعنی غیر جان دار شے کی تصویر بنانا خدا کی تخلیق کی نقالی کرنا نہیں ہے۔

اگر اِس عجیب بات کو مان لیں، تو پھر تخلیق اور نقالی دونوں الفاظ ہی اپنے معنی کھو دیتے ہیں۔ آدمی پھر یہ سمجھ نہیں پاتا کہ تخلیق کسے کہتے ہیں اور نقالی کیا ہوتی ہے۔ کیونکہ جان دار اور بے جان دونوں طرح کی اشیا تخلیق ہوتی ہیں اور اِن دونوں ہی کی نقالی کی جا سکتی ہے اور وہ نقالی ہی کہلائے گی۔ ایک نقالی کا بحیثیتِ نقالی ممنوع ہونا اور دوسری نقالی کا بحیثیتِ نقالی جائز ہونا، ایک ناقابلِ فہم بات ہے۔

زیرِ بحث روایت کا صحیح مفہوم

آپ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی اِس روایت کو دیکھیں اور اِس کا تجزیہ کریں۔ اِس میں ایک آدمی اُن سے یہ پوچھتا ہے کہ میرا پیشہ یہ تصاویر بنانا ہے، (کیا میرا یہ پیشہ درست ہے؟) آپ نے اُسے بتایا، (تیرا ان تصاویر کو بنانے کا پیشہ درست نہیں ہے،) نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص بھی کوئی تصویر بنائے گا، اسے قیامت کے دن اس میں روح پھونکنی پڑے گی، لہٰذا، اگر تجھے ضرور تصاویر ہی بنانی ہیں، تو اِس درخت کی تصویر بنا لے اور ہر اس چیز کی تصویر بنا لے، جس میں روح نہیں ہوا کرتی۔

یہ مشورہ ہمارے حِبر الامۃ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا مشورہ ہے۔ انھوں نے یہ مشورہ ایک آدمی کے خاص قسم کی تصاویر بنانے کے سارے معاملے کو دیکھ کر اُسے دیا تھا، کہ وہ شخص کون ہے، کس ماحول میں رہتا ہے، کس خاص نوعیت کی تصاویر بناتا ہے، کیوں بناتا ہے اور تصاویر کے حوالے سے اُسے اب کیا مسئلہ درپیش ہے، یہ سب کچھ دیکھ کر ہی 'حبر الامۃ' نے اُسے یہ مشورہ دیا تھا۔ آپ کا مشورہ یہ تھا کہ تم روح والی اشیا کی تصاویر نہ بنایا کرو، بلکہ اُن اشیا کی تصاویر بنایا کرو، جن میں روح نہیں ہوتی، اِس طرح تم غیر ممنوع تصاویر بنا کر اپنی روزی بھی کما لو گے اور آخرت میں ممنوع تصاویر بنانے کی بنا پر ہونے والے عذاب سے بھی محفوظ رہو گے۔ کیونکہ

تمہارے معاملے میں تصاویر بنانے کے حوالے سے تمہارا بس یہ (جان دار اور غیر جان دار کا) فرق کر لینا ہی کافی ہے۔

اگر یہ بات مان لی جائے کہ اِس روایت میں تصاویر کی حلت و حرمت کے حوالے سے اِبن عباس رضی اللہ عنہ کوئی اصولی بات نہیں کر رہے اور وہ ہر جان دار کی تصویر کو اصول کے طور پر، حرام اور ہر بے جان شے کی تصویر کو اصول کے طور پر، حلال قرار نہیں دے رہے، جیسا ہم نے پیچھے واضح کرنے کی کوشش کی ہے، تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے اِس فتوے میں سائل کو جان دار اشیا کی تصاویر بنانے سے منع کیوں کیا اور بے جان شے کی تصاویر کی اجازت کیوں دی اور سائل کو یہ تاثر کیوں دیا کہ وہ تصاویر بنانے میں جان دار اور بے جان کا یہ فرق ملحوظ رکھنے کے نتیجے میں، آخرت کے عذاب سے بچ جائے گا۔ اِس کے جواب سے پہلے یہ ضروری ہے ہم اُس دور اور اُس ماحول میں جا کھڑے ہوں جس میں ابنِ عباس رضی اللہ عنہ اُس آدمی کو یہ مشورہ دے رہے ہیں۔

ابنِ عباس رضی اللہ عنہ جس دور میں کھڑے ہو کر بات کر رہے ہیں اس میں مذہبِ شرک کے لیے تصاویر کا بنایا جانا بہت عام تھا، ان تصاویر میں روح کا اترنا، ان تصاویر کا صاحبِ تصرف ہونا عام مانا جاتا تھا[8]۔ آپ نے

۸۔ عربوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس ماحول میں تشریف لائے تھے، اُس میں چاروں طرف شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے۔ زندگی کا شاید کوئی ایک گوشہ بھی ایسا نہ تھا جو شرک سے محفوظ ہو۔ ملائکہ کی پرستش کی جاتی، جنات پوجے جاتے، چاند سورج اور ستاروں کی عبادت کی جاتی، پتھروں اور چٹانوں کو سجدہ کیا جاتا تھا۔ غرض طرح طرح کا شرک تھا، جو ان میں رائج تھا۔ وہ اپنے معبودوں کے بارے میں کیسے کیسے تصورات رکھتے تھے۔ اِس کے بارے میں ''المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام'' میں ڈاکٹر جواد علی نے بہت تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں۔ ذیل میں ہم ان کی کتاب کے چند ایسے حوالے درج کر رہے ہیں جو ہمیں اُس دور اور اُس ماحول میں جا کھڑا کرتے ہیں، جس میں خدا کی شریعت نازل ہوئی تھی اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے جس ماحول میں اُس شریعت کو سمجھا اور لوگوں سے بیان کیا تھا۔

معبودوں کے بارے میں عربوں کے تصورات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر جواد علی لکھتے ہیں کہ:

''عربوں کے ہاں بت 'Draw' کی ہوئی تصویروں، کُھدی ہوئی مورتوں اور گھڑے ہوئے مجسموں کی شکل میں پائے جاتے تھے۔'' (ج ۶۔ ص ۷۰)

"عربوں کا اپنے معبود لات کے بارے میں یہ تصور تھا کہ یہ دراصل، ایک آدمی تھا جو ایک چٹان کے اندر سما گیا تھا۔ چنانچہ وہ آدمی اُن کے ہاں معبود قرار دے دیا گیا۔ اُس چٹان پر انہوں نے ایک عمارت بنا دی۔ پھر وہ چٹان لات کہلانے لگ گئی اور اُس کی پرستش شروع ہو گئی۔" (ج ٦۔ ص ٦٨۔ ٦٩)

"عربوں کا یہ عقیدہ تھا کہ بتوں کے اندر ارواح پنہاں ہوتی ہیں۔ یہ ارواح لوگوں سے باتیں بھی کرتی ہیں اور انھی ارواح نے لوگوں کو وہ قصہ بھی الہام کیا تھا، جو انہوں نے اُس وقت بیان کیا، جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتوں کو ڈھانے کا حکم دیا تھا، کہ جونہی مسلمان ان بتوں کو ڈھائیں گے اِن کے اندر سے جن نکلیں گے۔" (ج ٦۔ ص ٦٩)

"عربوں کے اِسی عقیدے کی بنا پر کہ بتوں کے اندر ارواح اور جنات پائے جاتے ہیں اور اگر ان بتوں کو توڑنے کی کوشش کی گئی تو وہ ارواح اور جنات باہر نکل کر توڑنے والے کو ہلاک کر دیں گے، بعض (کمزور ایمان والے) وہ لوگ جو بت توڑنے والوں میں شامل تھے، وہ ڈر گئے۔" (ج ٦۔ ص ٦٩)

"عربوں کے ہاں بتوں کو مافوق الفطرت قوتوں کا نمائندہ یا مظہر قرار دیا جاتا تھا اور یہ بھی گمان کیا جاتا تھا کہ یہ مافوق الفطرت قوتیں اُن بتوں کے اندر پنہاں ہیں۔ یہ بت انسانوں، حیوانوں اور پتھروں کی شکل کے ہوا کرتے تھے۔ اِنہیں پوجنے والوں کے ہاں اِن کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں۔" (ج ٦۔ ص ٦٩)

"عرب بت پرست جن کلمات سے اپنے بتوں کو مخاطب کرتے تھے، اُن سے پتا چلتا ہے کہ وہ بتوں میں ارواح کو موجود سمجھتے تھے، چنانچہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ بت سنتے اور جواب دیتے ہیں۔ وہ اِس بات کے قائل تھے کہ روح پتھر میں حلول کر جاتی ہے۔ مالک بن حارثہ روایت کرتے ہیں کہ اُن کا باپ انہیں دودھ دیا کرتا اور انہیں کہتا کہ وہ یہ دودھ 'ود' بت کے پاس لے جائیں اور اُسے پلائیں۔ مالک وہ سارا دودھ خود پی جاتے اور بت کے سامنے ایک قطرہ بھی نہ رکھتے۔--- غرض یہ کہ عرب بتوں میں عقل، سمجھ سماعت اور بصارت کی صفات کو مانتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ یہ بت باوجود پتھر ہونے کے ذی روح ہیں۔" (ج ٦۔ ص ١٤١، ١٤٢)

"عرب بتوں کے لیے جو معبد بناتے، اُن میں بتوں کے سامنے ایسی جگہیں بنی ہوتیں، جہاں زائرین اپنے نذرانے ڈالا کرتے تھے۔ اِن نذرانوں میں عام طور پر زیور، سونے چاندی کی بنی ہوئی اشیا اور دوسری قیمتی چیزیں ہوا کرتی تھیں۔ اِسی طرح یہ لوگ بتوں کا تقرب حاصل کرنے اور اپنی نذریں پوری کرنے کے لیے اُن کے گلے میں تلواریں لٹکا دیتے اور قیمتی کپڑے اِن کے اوپر ڈال دیتے تھے۔ عرب یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اِن بتوں میں روحیں موجود ہوتی ہیں، چنانچہ یہ بت اِن نذرانوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔" (ج ٦۔ ص ١٨٨، ١٨٩)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اُس دور میں موجود ایک مصور کو یہ تلقین کی کہ اُن چیزوں کی تصاویر بناؤ جن کی تصاویر کے بارے میں یہ خیال ہی پیدا نہیں ہو سکتا کہ اِن تصاویر میں روح اترتی ہے۔ ظاہر ہے یہ تصاویر عام طور پر ایسی ہی چیزوں کی ہو سکتی ہیں، جنھیں حیات کبھی میسر ہی نہ رہی ہو۔ جیسے درخت اور پتھر وغیرہ، اُس دور کے تصور کے مطابق یہ بے جان اشیا ہیں۔ ایسی اشیا کی تصاویر میں ارواح کے اترنے کا سوال ہی کیا پیدا ہو گا۔ انسان کا ذہن تو ایسی چیزوں کے بارے میں عموماً یہ سوچتا ہی نہیں کہ یہ زندہ ہو سکتی ہیں اور تصرف کر سکتی ہیں۔ جو شے زندہ وجود رکھتی ہو گی، عام طور پر اُسی کی تصویر کے بارے میں زندگی کا تصور پیدا ہو گا۔ اِسی طرح آپ دیکھیں کہ وہ وجود جو اپنی موت سے پہلے زندہ وجود تھے، موت کے بعد اگر کسی حیات کا تصور پیدا ہوا ہے، تو عموماً، اُنھی کے بارے میں ہوا ہے۔ انسان نے کتنے ہی لوگوں کی قبروں کے بارے میں یا اُن کے مجسموں کے بارے میں، اُن کے مرنے کے بعد یہ تصور بنا لیا کہ یہ زندہ ہیں اور صاحبِ تصرف ہیں۔ جیسے قومِ نوح علیہ السلام میں وَد، سواع، یغوث، یعوق اور نسر یا پھر وہ سیکڑوں حقیقی یا غیر حقیقی زندہ وجود، جن کے مجسمے کعبے میں دھرے ہوئے تھے۔

یہاں یہ بات بھی ہم واضح کرنا چاہیں گے کہ سورج اور چاند ہمارے نزدیک تو بے جان وجود ہیں لیکن ان کی پرستش جن اقوام میں رائج رہی ہے ان کے ہاں ان اجرام فلکی کو ذی روح گردانا گیا ہے۔ اور انھیں زندہ اور صاحبِ تصرف وجود قرار دیا گیا ہے[9]۔

سورج اور چاند چونکہ انسان کو اس کائنات میں متحرک نظر آئے اور اس نے ان کو مدو جزر سے لے کر فصلوں کے پکنے تک سیکڑوں کاموں کا باعث دیکھا، لہٰذا اس نے انھیں موثر بالذات جانا اور ان کی پرستش

”عربوں کا یہ تصور تھا کہ اُن کا معبود اُن کی طرف سے بھرپور دفاع کرتے ہوئے، لڑتا ہے اور اِس وجہ سے مختلف قبائل اور لشکر اپنے ساتھ اپنے معبودوں کی تصاویر اور اُن کے مجسمے یا کچھ مقدس دینی علامات رکھتے تھے۔ اِن سے وہ برکت حاصل کرتے اور جنگ میں نصرت طلب کرتے۔“ (ج ۶۔ ص ۶۱)

”جب کوئی قبیلہ جنگ ہار جاتا تو وہ یہی سمجھتا کہ اِس جنگ میں دراصل اُس کا معبود ہار گیا ہے۔“ (ج ۶۔ ص ۱۰)

۹۔ ڈاکٹر جواد علی اپنی تصنیف المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام میں لکھتے ہیں کہ:

”بعض لوگوں نے مظاہرِ قدرت مثلاً چاند، سورج اور بعض ستاروں کی پرستش اختیار کی۔ ان کا یہ گمان تھا کہ ان مظاہرِ فطرت میں وہ صاحب تصرف روح پوشیدہ ہے جو اس دنیا پر اور انسان کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔“

(ج ۶، ص ۲۲)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

شروع کر دی۔ لیکن جن چیزوں کے بارے میں اس کا یہ تاثر نہیں بنا، ان کو اس نے مخلوق ہی سمجھا ہے۔

بہر حال ہمارا یہ خیال ہے کہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے اُس مصور کو روح والی اشیا کی تصاویر بنانے سے اسی لیے منع کیا تھا تا کہ اُس کے ہاتھ سے کوئی ایسی تصویر نہ بنے، جو کسی معبود کی تصویر ہو، جس میں روح موجود سمجھی جاتی ہو۔ چنانچہ آپ نے اُسے ایسا مشورہ دیا، جس سے وہ مصور اپنے ماحول میں، تمام مظہرِ شرک تماثیل کو وجود میں لانے کے جرم سے بچ سکتا تھا۔

اب آپ پلٹ کر ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی اُس روایت کو دیکھیے، جسے ہم پہلے بیان کر آئے ہیں اور جو سنداً زیادہ قوی بھی ہے۔ کیا خود 'حبر الامۃ' بالکل یہی بات نہیں کہہ رہے۔ اُس روایت میں یہ بتانے کے لیے کہ وہ کون سی تماثیل ہیں جن کے بارے میں نبی ﷺ نے کہا ہے کہ اُن کی موجودگی میں فرشتے گھر میں داخل نہیں ہوتے، یعنی نبی ﷺ نے کس نوعیت کی اور کس قسم کی تماثیل (مجسمے اور تصاویر) ممنوع قرار دی ہیں، ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے خود یہ الفاظ: ''یرید التماثیل التی فیھا الارواح'' بولے ہیں کہ ممنوع تماثیل سے آپ ﷺ کی مراد وہ تماثیل ہیں، جن میں ارواح ہوتی ہیں۔ ہمارے نزدیک ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے اِس جملے کا اِس کے سوا اور کوئی مطلب بنتا ہی نہیں۔ آپ غور کیجیے جیسا کہ ہم نے پیچھے بھی بیان کیا ہے کہ اِن ممنوع تماثیل سے مراد عام تماثیل نہیں ہیں، بلکہ یہ وہ تماثیل ہیں جن میں ارواح ہوتی ہیں، یعنی وہ تماثیل جو زندہ خیال کی جاتی ہیں۔ جیسے کہ مشرکینِ مکہ لات، عزیٰ، منات اور دوسرے دیوی دیوتاؤں کی تماثیل کے بارے میں خیال کرتے تھے۔ ظاہر ہے، جبھی تو وہ اُن کو حاجت روا سمجھتے، اُن سے دعائیں مانگا کرتے اور آخرت میں اُن کی شفاعت کی توقع رکھتے تھے۔ پس ہمارے خیال میں ابنِ عباس رضی اللہ عنہ اِس دوسری روایت میں بھی بالکل وہی بات کہہ رہے ہیں جو انھوں نے پہلی روایت میں فرمائی ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلی روایت میں آپ حرام تماثیل کی نوع کا خاصہ (خاصے سے مراد وہ خاص صفت جو اُس کو ایک الگ نوع بناتی ہے) بیان کرتے ہوئے، اُنھیں واضح کر رہے ہیں تا کہ نبی ﷺ کی حدیث سننے والا کسی غلط فہمی میں نہ رہے کہ آپ کون سی تماثیل حرام قرار دے رہے ہیں اور دوسری روایت میں آپ ایک مصور کو اُس کے تصاویر بنانے کے بارے میں اُس کے احوال کے مطابق ایک مشورہ دے رہے ہیں۔ دونوں روایتوں کے اِس فرق سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ پہلی روایت میں چونکہ ممنوع تصاویر کی نوع کو اصول میں بیان کیا گیا ہے اور دوسری میں اُس اصول کا اطلاق کرتے ہوئے، ایک خاص مصور کو ممنوع تصاویر کے حوالے سے وہ عملی مشورہ دیا گیا ہے، جو اُس کے احوال میں

اُس کے لیے موزوں تھا، لہٰذا یہ لازم ہے کہ پہلی روایت کی روشنی ہی میں دوسری روایت کو سمجھا جائے۔ خصوصاً جب کہ یہ پہلی روایت ہی سنداً زیادہ قوی بھی ہے۔اِس ساری بحث کے بعد ہم بہت اطمینان سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ تصاویر کے بارے میں فہمِ صحابہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے جو حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ بھی اُنھی تماثیل (تصاویر و مجسموں) کو ممنوع سمجھتے تھے، جو مظہرِ شرک ہوتی تھیں۔

یہاں ضروری ہے کہ ہم مسندِ احمد کی اُن دو روایتوں کو بھی دیکھ لیں، جن میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی حقیقت ذرا مختلف الفاظ سے بیان کی ہے۔ان احادیث کو ابتدا میں نہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ یہ الفاظ بس مسند احمد ہی کی ان دو یا تین روایتوں میں استعمال کیے گئے ہیں، جب کہ وہاں ابتدا میں جہاں اصل بحث کی گئی ہے، ہم اُنھی احادیث کو لائے ہیں، جن کے الفاظ بہت سے راویوں نے روایت کیے ہیں۔

عن ابْن عَبَّاسٍ يَقُولُ سَمِعْتُ أَبَا طَلْحَةَ يَقُولُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَلَا صُورَةُ تَمَاثِيل.
(مسند احمد: اول مسند المدنیین اجمعین)

''ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو طلحہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اُس گھر میں فرشتے داخل نہیں ہوتے جس میں کتا ہو یا تماثیل کی تصویر ہو۔''

عَنْ نُجَيٍّ--- قَالَ عَلِي--- قَالَ رسول الله صلى الله عليه وسلم ---- قال جبريل--- إِنَّهَا ثَلَاثٌ لَنْ يَلِجَ مَلَكٌ (دارا) مَا دَامَ فِيهَا أَبَدًا وَاحِدٌ مِنْهَا كَلْبٌ أَوْ جَنَابَةٌ أَوْ صُورَةُ رُوحٍ.
(مسند احمد۔العشرۃ المبشرین بالجنتہ)

''نجی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جبریل فرماتے ہیں کہ تین چیزیں اگر کسی (گھر) میں موجود ہوں تو فرشتہ اُس (گھر) میں کبھی نہیں جاتا۔ ان تین میں سے ایک کتا ہے دوسری جنبی آدمی اور تیسری روح کی تصویر۔''

ان دو احادیث میں نئی بات صرف اتنی ہے کہ پہلی میں تماثیل کی تصویر کو ممنوع قرار دیا گیا اور دوسری میں روح کی تصویر کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔سوال یہ ہے کہ تماثیل کی تصویر سے اور روح کی تصویر سے کیا مراد ہے؟

تماثیل کے معنی میں، جیسے کہ اِس مضمون میں بار بار سامنے آیا ہے تصاویر اور مجسمے دونوں ہی شامل ہیں۔ لیکن لفظ و معنی کی اِس ترکیب یعنی ''صورۃ تماثیل'' سے بننے والے مرکبِ اضافی کی صورت میں تماثیل سے

مراد وہ (پوجی جانے والی) اشیا ہیں، جن پر تصاویر بنی ہوتی ہیں۔ چنانچہ تماثیل کی تصاویر سے، پوجی جانے والی اشیا پر بنی ہوئی، تصاویر مراد ہیں۔ ظاہر ہے یہ تصاویر بھی ممنوع ہی ہونی چاہییں۔ پس یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ ایسی سب تصاویر بھی ممنوع ہی ہیں، جو کسی پوجی جانے والی شے پر بنائی جاتی ہیں۔

اِس کے بعد اب دوسری حدیث میں آنے والے صورۃ روح کے الفاظ کو دیکھیں۔ یہ الفاظ اُسی پس منظر کے لحاظ سے بولے جا رہے ہیں، جس کا ہم پیچھے بہت تفصیل سے مطالعہ کر آئے ہیں۔ چنانچہ صورۃ روح کا مطلب ہے، روح والی تصویر، وہ تصویر جس کے بارے میں یہ عقیدہ ہو کہ اُس میں روح موجود ہے۔ ''صورۃ روح'' کے الفاظ کی تالیف، ''صورۃ فیہا روح'' ہے۔ عربی میں اس کی مثال ''بستان اشجار''، یعنی بستان فیہا اشجار ہے یا ''دار السلام''، یعنی ''دار فیہا السلام'' ہے۔ پس دوسری حدیث ہمیں یہ بتاتی ہے کہ وہ تصاویر ممنوع ہیں جن میں ارواح ہوتی ہیں۔

چنانچہ تصویر کے بارے میں فہمِ صحابہ کا مطالعہ کرنے سے بھی جو بات سامنے آتی ہے وہ یہی ہے کہ بس وہی تصاویر ممنوع ہیں، جو مظہرِ شرک ہیں۔

یہ ساری بحث تصویر کے بارے میں فہمِ صحابہ سے متعلق تھی۔ اِس کے بعد اب ہم یہ دیکھیں گے کہ تصویر ہی کے حوالے سے صحابہ کے ہاں کیا عملی رویہ پایا جاتا تھا اور پھر اُن کے بعد تابعین کا کیا نقطۂ نظر اور کیا عمل تھا۔

(باقی)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی / منظور الحسن

اجتہاد کی ضرورت اور اہمیت

(روزنامہ ''نواے وقت'' کے ''ایوانِ وقت'' میں جناب جاوید احمد غامدی کی گفتگو)

موجودہ زمانے میں لفظِ اجتہاد کو ہمارے علمی حلقوں نے غلط مفہوم میں استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ میں نے بالعموم یہ دیکھا ہے کہ لوگ دین کے بعض احکام اور شریعت کی بعض ہدایات کے بارے میں جب یہ لفظ استعمال کرتے ہیں، تو ان کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ تمدن کے ارتقا اور زمانے کے تغیرات کے نتیجے میں ان احکام و ہدایات کا اطلاق ناممکن ہو گیا ہے، اس لیے ان میں اجتہاد کر کے انھیں دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق بنانے کی سعی کرنی چاہیے۔ میرا احساس ہے کہ یہ بات لفظِ اجتہاد کے مفہوم کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔

اجتہاد کا لفظ جس ماخذ سے وجود پذیر ہوا ہے، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب مشہور حدیث ہے جو آپ کی سیدنا معاذ بن جبل کے ساتھ ایک گفتگو پر مبنی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سیدنا معاذ بن جبل کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو فرمایا: تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انھوں نے عرض کیا: اس ہدایت کے مطابق، جو اللہ کی کتاب میں ہے۔ حضور نے فرمایا: اگر اللہ کی کتاب میں کوئی ہدایت نہ ملے؟ عرض کیا: پھر اللہ کے رسول کی سنت کے مطابق۔ فرمایا: اگر اس میں بھی نہ ملے؟ عرض کیا: اجتهد برائی و لا آلوا جهداً (پھر میں انتہائی کوشش کروں گا کہ اپنی رائے قائم کروں اور اس میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمایا: اللہ کا شکر ہے جس نے تمھیں وہ بات کہنے کی توفیق دی جو اللہ کے رسول کو پسند ہے۔

یہی وہ روایت ہے جس کی بنا پر اجتہاد کا لفظ ہمارے ہاں فقہ و قانون میں استعمال ہونے لگا ہے۔ اس ماخذ کو اگر پیشِ نظر رکھیں تو اجتہاد کا مطلب دین کے احکام کو زمانے کے لحاظ سے تبدیل کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن و سنت جن معاملات میں خاموش ہیں ان کے بارے میں عقل و فطرت کی روشنی میں رائے قائم کی

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

جائے۔ یہی اجتہاد کا صحیح مفہوم ہے۔ اہلِ علم کو اس مفہوم کو واضح کرنا چاہیے اور اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہیے، جس کی بنا پر آج ایک عام شخص بھی اٹھ کر یہ کہہ دیتا ہے کہ قرآنِ مجید میں بیان کی گئی فلاں سزا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی فلاں ہدایت دورِ حاضر میں قابلِ عمل نہیں رہی، لہٰذا اس کے بارے میں اجتہاد ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے جو احکام ہمیں قرآنِ مجید کے ذریعے سے دیے ہیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہدایات اپنی سنت کے ذریعے سے دی ہیں وہ محلِ اجتہاد نہیں ہیں بلکہ محلِ تحقیق ہیں۔ یعنی یہ جانا جائے گا کہ قرآن و سنت کے کسی حکم کا صحیح مدعا کیا ہے۔ یہ دیکھا جائے گا کہ قرآن و سنت کے کسی منشا کو لوگوں نے غلط تو نہیں طے کر لیا۔ تحقیق کی خامی کو متعین کیا جائے گا، تعبیر کی غلطی کو واضح کیا جائے گا، لیکن یہ ساری کوشش دین کے صحیح منشا تک پہنچنے کے لیے ہو گی نہ کہ اس میں کسی تغیر و تبدل کے لیے۔

معاملاتِ زندگی کے بارے میں شریعت کے دو دائرے ہیں: ایک دائرہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے معاملات سے متعلق ہے۔ یہ دائرہ بندگی اور پرستش کے امور پر مشتمل ہے۔ اس میں شریعت نے آخری درجے کی قانون سازی کر دی ہے۔ ان تعبدی امور میں شریعت انسانوں کو یہ اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنی طرف سے کوئی بات کہیں۔ ان امور میں اگر کوئی حکم دے دیا گیا ہے تو اس پر عمل کیا جائے گا۔ کسی بات سے منع کر دیا گیا ہے تو اس سے گریز کیا جائے گا۔ اس دائرے کے متعین احکام سے ایک قدم بھی اگر آگے اٹھایا جائے گا تو یہ بدعت اور گمراہی قرار پائے گا۔ چنانچہ قرآنِ مجید کے اس اعلان کا کہ دین ہر لحاظ سے پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے، یہ لازمی تقاضا ہے کہ ان امور میں کوئی مداخلت نہ کی جائے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دوسرا دائرہ بندوں اور بندوں کے معاملات سے متعلق ہے۔ اس دائرے میں سیاست کے معاملات ہیں، معیشت کے معاملات ہیں، معاشرت کے معاملات ہیں، آدابِ زندگی سے متعلق امور ہیں، حدود و تعزیرات ہیں۔ ان تمام معاملات میں شریعت نے بعض امور کو انجام دینے کا حکم دیا ہے اور بعض امور سے منع کیا ہے۔ اس ضمن میں شریعت صرف ان امور سے بحث کرتی ہے، جن میں عقلِ انسانی نے ٹھوکر کھائی ہے یا اس کے ٹھوکر کھانے کا امکان ہے۔ چنانچہ گنتی کی چند چیزیں ہیں جن کو شریعت نے متعین کیا ہے۔ مثلاً معیشت سے متعلق سات آٹھ احکام ہیں، اسی طرح چند ایک احکام سیاست سے متعلق ہیں، کچھ احکام معاشرت کے حوالے سے بیان کیے گئے ہیں، پانچ سات چیزیں آداب و شعائر کے بارے میں متعین کر دی گئی ہیں، حدود و تعزیرات میں صرف پانچ جرائم ہیں جن کی سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ باقی معاملات کو عقلِ انسانی پر چھوڑ دیا گیا

ہے۔ یہ سب معاملات دین کی روشنی میں اجتہاد ہی سے طے کیے جائیں گے۔ مسلمانوں کے اہلِ علم و دانش، تمدن، حالات اور عرف و رواج کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، ان معاملات میں قانون سازی کر سکتے ہیں۔

نہ سوسائٹی کو ایک جگہ روکا جا سکتا ہے نہ اس کے تمدن کو جامد کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے اجتہاد کی ضرورت بھی ختم نہیں ہو سکتی۔ شریعت ابدی ہے جبکہ اجتہاد ابدی نہیں ہوتا۔ اسے وقت اور حالات کے لحاظ سے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ایک ملک کے لوگ اپنے حالات، اپنے تمدن، اپنی ثقافت اور اپنی معاشرت کے لحاظ سے ایک رائے اختیار کر سکتے ہیں اور دوسرے ملک کے لوگ دوسری رائے اختیار کر سکتے ہیں۔ بہر حال اجتہاد معاشرے کی ترقی اور بقا کے لیے ناگزیر ہے۔ اگر اس راستے کو بند کر دیا جائے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی فرد کو پانی سے محروم کر دیا جائے۔

یہ اجتہاد کی ضرورت اور اہمیت کے حوالے سے میرا نقطۂ نظر ہے۔ اس معاملے میں دو سوالات البتہ بہت اہم ہیں:

ایک یہ کہ کیا اجتہاد کے لیے کچھ شرائط ہیں؟

دوسرا یہ کہ اجتہاد قانون کی صورت کس طرح اختیار کرتا ہے؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ اجتہاد کے معاملے میں شرائط کی بحث بالکل بے معنی ہے۔ یہ کسی اجتہاد کرنے والے کا اپنے اجتہاد کے لیے استدلال ہے جو اس کی صحت یا عدمِ صحت کا فیصلہ کرتا ہے۔ جو شخص اپنی اجتہادی رائے پیش کرے گا، وہ اس کی دلیل بھی لازماً دے گا۔ یہ دلیل اگر قوی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی مفروضہ شرائط کی بنیاد پر اس کی رائے کو رد کر دیں اور اگر دلیل کمزور ہے تو اجتہاد کیسی ہی جامع الشرائط شخصیت نے کیوں نہ کیا ہو، اسے بہر حال ناقابلِ قبول قرار پانا چاہیے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اجتہاد کو قانون کی حیثیت صرف مسلمانوں کے اربابِ حل و عقد کی اکثریت کے فیصلے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ اربابِ حل و عقد بحث و تمحیص سے خود بھی کوئی رائے قائم کر سکتے ہیں اور اپنے علاوہ کسی صاحبِ علم و فن کی رائے قبول بھی کر سکتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں فیصلہ بہر حال انھی کو کرنا ہے۔ ان کی اکثریت جس اجتہاد کو قبول کر لے گی، وہ قانون کی حیثیت سے نافذ العمل قرار پائے گا۔ مسلمانوں میں سے کسی شخص کے لیے اس کی خلاف ورزی جائز نہ ہو گی۔ اس سے اختلاف کا حق، البتہ ہر شخص کو حاصل رہے گا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اربابِ حل و عقد کی اکثریت کسی کے اختلاف سے متاثر ہو کر قانون میں تبدیلی

کا فیصلہ کر لے۔ چنانچہ قرآن و سنت کی تعبیر کا مسئلہ ہو یا کسی ایسے معاملے میں اجتہاد کا، جس میں قرآن و سنت خاموش ہیں، یہ مسلمانوں کے منتخب نمائندے ہی ہیں جن کے فیصلے سے اسے اسلامی معاشرے میں قانون کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد وسیم اختر مفتی

قسم اور کفارۂ قسم کے احکام

قرآن مجید کا حکیمانہ اسلوب

سورۂ مائدہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ط فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ط ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ط وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ط كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ.(۵:۸۹)

''اللہ تعالیٰ لغو قسم (کے توڑنے) پر تم سے (کفارے کی صورت میں دنیوی) مواخذہ نہیں فرماتے۔ لیکن ایسا مواخذہ تب کرتے ہیں کہ تم قسموں کو (آیندہ بات پر) مستحکم کرو (اور پھر توڑ دو) سو اس (قسم کے توڑنے) کا کفارہ دس محتاجوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلانا، جو تم اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہو، یا ان کو کپڑا دینا یا ایک غلام آزاد کرنا ہے۔ جو (ان تینوں میں سے ایک کی بھی) طاقت نہ رکھتا ہو (اس کے لیے کفارہ) تین دن کے روزے رکھنا ہے۔ یہ تمھاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم کھاؤ (اور توڑ دو)۔ اپنی قسموں کا خیال رکھا کرو۔ یوں ہی اللہ تعالیٰ تمھاری خاطر اپنے احکام کی وضاحت کرتے ہیں تاکہ تم ان کے شکر گزار رہو۔''

اس آیت میں قسم کھا کر توڑنے کی صورت میں ادا کیے جانے والے کفارے کے احکام بیان کیے گئے ہیں۔

بظاہر ایک فقہی مسئلے کا حل بتایا گیا ہے کہ اگر آدمی ایسی قسم کھا بیٹھے جو پوری نہ کر سکے تو اسے کیا کرنا ہو گا۔ لیکن اس فقرے کی تالیف میں ایسی حکمتیں اور بلاغتیں مخفی ہیں، جو قرآنِ حکیم کے طالب علموں سے اوجھل نہیں رہنی چاہییں۔

اللغو کا مفہوم

بعض لوگ اللہ قسم، تیری جان کی قسم یا ایسے ہی الفاظ کو تکیۂ کلام بنا لیتے ہیں۔ قسمیں بے اختیار ان کے ہونٹوں سے پھسلی پڑتی ہیں اور کچھ اپنی ہر قیاس آرائی کو قسم کھا کر معتبر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی عادت کو لغو کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی یہ ایک فضول اور غیر سنجیدہ طریقہ ہے۔ اہلِ ایمان کو اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ قرآنِ مجید میں شایستہ لوگوں کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں، ان میں یہ بات خاص طور پر فرمائی گئی ہے کہ وہ لغو چیزوں سے احتراز کرتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من حسن اسلام المر ترکه ما لا یعینه. ”مسلمان کے اسلام کی خوبی یہی ہے کہ وہ بے فائدہ اور بے معنی باتیں کرنا چھوڑ دے۔“ (مؤطا امام مالک، حسن الخلق)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تادیب میں بھی شفقت

’لا یواخذکم‘ کے الفاظ سے اللہ تعالیٰ نے تسلی دی ہے کہ فکر نہ کرو ہماری شفقت کا تقاضا ہے کہ ہم در گزر کریں، ایسی قسموں کے کھا کر پورا نہ کرنے پر کوئی دنیوی سزا مقرر نہ کریں اور اگر یہ قسمیں اوپری دل سے ہیں تو آخرت میں بھی باز پرس نہ کریں۔ ایک بات از خود سمجھ میں آجاتی ہے کہ بار بار لغو قسم کھانا، اسے مستقل طریقہ بنا لینا بہر حال ایک ناشایستہ عمل ہے اور اس عادت کی وجہ سے قابلِ گرفت اعمال سرزد ہو سکتے ہیں۔

موکد قسم کا حکم

کسی فعل کو آیندہ کرنے یا نہ کرنے پر ارادۃً قسم کھائی جائے تو اسے یمین منعقدہ کہتے ہیں۔ یہ عہد اور عقد کے درجے میں آجاتی ہے۔ اسی کے بارے میں ’بما عقدتم الایمان‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ ایسی قسم توڑنا گناہ بھی ہے اور اس کے توڑنے پر وہ کفارہ بھی لازم ہو جائے گا جو آیت میں مذکور ہوا۔ عہد کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدۡتُّمۡ وَلَا تَنۡقُضُوا ”اور اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرو

الْاَیۡمَانَ بَعۡدَ تَوۡکِیۡدِھَا.(النحل۱۶:۹۱) جب تم عہد کر چکو۔ اور قسموں کو موکد کرنے کے بعد انھیں مت توڑو۔''

وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ ۚ اِنَّ الۡعَهۡدَ کَانَ مَسۡـُٔوۡلًا . (بنی اسرائیل۱۷:۳۴) ''اور عہد کو پورا کرو کیونکہ عہد کے بارے میں ضرور پرسش ہو گی۔''

جو عہد بندہ اللہ سے کرتا ہے اس کے عدم ایفا کا معصیت ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن بندے کا بندے سے کیا ہوا عہد بھی محترم ہوتا ہے، اس لیے کہ اس میں خدا کی گواہی شامل ہوتی ہے جیسا کہ 'وقد جعلتم اللّٰہ علیکم کفیلا'[۱] ''درآنحالیکہ تم اللہ کو (اپنی قسمیں پختہ کرنے کے لیے) اپنے اوپر گواہ ٹھیرا چکے ہو'' کے الفاظ سے واضح ہے۔ مومن کی تو زندگی ہی عہدِ الست سے شروع ہوتی ہے اور ایمان و اخلاص کا عہد اس کے آخری سانس تک برقرار رہتا ہے۔

آیت کی بلاغت اور اسلوب کی حکمتیں

دلچسپ بات ہے کہ قسم توڑنے کے احکام بیان کیے جا رہے ہیں لیکن توڑنے کے ہم معنی کوئی لفظ ذکر نہیں کیا گیا۔ 'کفارتہ..' ''قسم کا کفارہ' فرمایا ہے 'کفارۃ نقضہ..' ''قسم کے توڑنے کا کفارہ' نہیں کہا۔ اسی طرح 'ذلک کفارۃ ایمانکم اذا حلفتم' 'یہ تمھاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم کھاؤ۔ میں بھی 'اذا حلفتم' کے بعد 'ونقضتم الحلف' 'اور تم قسم توڑ دو۔ کے الفاظ مفہوم ہیں، مذکور نہیں۔ ہم نے ترجمہ کرتے وقت خطوط وحدانی کے ذریعے سے یہ محذوفات کھول دیے ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ قسم پورا کرنا اصل طریقہ ہے۔ توڑنا ایک دوسرے درجے کا اور خلافِ اولیٰ عمل ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے صراحتاً اس کا ذکر کرنا بھی پسند نہیں فرمایا۔

کفارے کی ضرورت

انسان بسا اوقات ایسی قسمیں کھا لیتا ہے جنھیں پورا کرنا اس کے بس میں نہیں ہوتا یا حالات کے بدل جانے سے ایفا ممکن نہیں رہتا یا کسی قسم کے پورا کرنے سے اللہ کا یا کسی بندے کا حق مارا جاتا ہے۔ ان تمام صورتوں میں اس کے لیے قسم سے باہر نکلنے کی راہ رکھی گئی ہے اور نقضِ عہد کی سزا کے طور پر کفارہ مقرر کر دیا گیا ہے جو اصل

۱۔ النحل۱۶:۹۱۔

میں مالی تاوان ہے تاکہ ادائیگی کے وقت جرم کی سنگینی کا احساس ہو یا اس کے بدلے میں روزے رکھنے کا جو حکم ہوا جو بدنی مشقت کا احساس دلاتا ہے۔

ایفاے قسم کے بارے میں ترغیبِ ربانی

بیانِ احکام کے بعد 'واحفظوا ایمانکم' اپنی قسموں کا خیال رکھا کرو۔ فرمایا تاکہ یہ بات پختہ ہو جائے اور دل میں جاگزیں رہے کہ قسموں کو پورا کرنا ہی اہلِ ایمان کا شیوہ ہے۔ قسم کی حفاظت کا مفہوم ہے کہ آدمی بات بے بات قسم نہ کھائے۔ ایسی قسم نہ اٹھائے جس سے کسی دینی فریضہ میں خلل آتا ہو یا کسی کا حق تلف ہوتا ہو۔ جب وہ قسم کو موکد کر لے تو اسے ہر ممکن صورت میں پورا کرے اور اگر کوئی بہتر صورت نظر آئے تو قسم کا کفارہ ادا کر کے عقدِ یمین سے باہر نکل آئے۔

قسم کے بارے میں نبیِ کریم کے احکام اور آپ کا تعامل

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قسم سے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام وارشادات کو بھی سامنے رکھ لیا جائے تاکہ اس حکمِ خداوندی کے عملی اطلاقات کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے:

من نذر ان یطیع اللہ فلیطعه و من نذر ان یعصیه فلا یعصه. (کتاب الایمان والنذور)

"جس آدمی نے نذر مانی کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حکم بجا لائے گا وہ حکم بجا لائے اور جس نے نذر مانی کہ وہ اللہ کی نافرمانی کرے گا وہ نافرمانی نہ کرے۔"

امام مسلم نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی ہے:

لا وفاء لنذر فی معصیة ولا فیما لا یملک العبد. (کتاب النذور والایمان)

"معصیت کے کام کی اور بندے کی طاقت سے باہر کے کام کی نذر کو پورا کرنا واجب نہیں۔"

حضرات محدثین نے نذر اور یمین منعقدہ کے احکام کو ایک ساتھ بیان کیا ہے۔ کیونکہ دونوں اللہ سے عہد کے حکم میں ہوتے ہیں۔ دونوں کو توڑنا گناہ ہے اور دونوں کے پورا نہ کرنے کا کفارہ ایک ہی ہے۔ جیسا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کفارته کفارة یمین. (سنن ابی داؤد، کتاب الایمان والنذور)

"نذر پوری نہ کرنے پر وہی کفارہ دینا ہو گا جو قسم کے توڑنے پر دیا جاتا ہے۔"

قسم کے آداب میں شامل ہے کہ اللہ کے سوا کسی کے نام کی قسم نہ کھائی جائے۔

حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفر کے دوران میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے باپ خطاب کی قسم کھاتے ہوئے سنا تو فرمایا:

الا ان اللّٰه منها كم ان تحلفوا بابائكم ، من كان حالفاً فليحلف باللّٰه او ليصمت.

(صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور)

''سن لو اللہ تعالیٰ تمھیں اپنے باپ دادا کی قسم کھانے سے منع کرتا ہے جو قسم کھانا چاہتا ہے، وہ اللہ کی قسم کھائے یا خاموش رہے۔''

ایسا بھی ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بات حلف کے انداز میں کہی مگر حالات کے بدل جانے سے اس کے برعکس عمل فرمایا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

انى اتيت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فى رهط من الاشعريين نستحمله فقال واللّٰه ما احملكم وما عندى ما احملكم عليه فلبثنا ما شآء اللّٰه فاتى رسول اللّٰه بنهب ابل فدعانا فامرلنا بخمس ذود غر الذرى قال فلما انطلقنا قال بعضنا لبعض اغفلنا رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يمينه لا يبارك لنا فرجعنا فقلنا يا رسول اللّٰه انا اتيناك نستحملك وانك حلفت الا تحملنا ثم حملتنا افنسيت يا رسول اللّٰه قال انى واللّٰه ان شاء اللّٰه لا احلفن على يمين فارى غيرها خيراً منها الا اتيت الذى هو خير وتحللتها فانطلقوا فانما

''میں اشعر قبیلے کے کچھ لوگوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا ہم غزوۂ تبوک کی تیاری کے لیے کچھ سواریاں مانگنے گئے تھے۔ آپ نے فرمایا: اللہ کی قسم میں تمھیں سواری نہ دے سکوں گا اور نہ ہی میرے پاس اونٹ ہیں جو تمھیں دے سکوں۔ ہم نے کچھ دیر انتظار کیا جو اللہ کی مشیت میں تھا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس غنیمت میں آئے ہوئے کچھ اونٹ پہنچے۔ آپ نے ہمیں بلایا اور پانچ سفید کوہانوں والی اونٹنیاں دینے کا حکم دیا۔ جب ہم واپس ہوئے تو ہم میں سے کسی نے کہا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی قسم بھلا دی ہے۔ ہماری سواریوں میں برکت نہ ہو گی۔ چنانچہ ہم پلٹے اور کہا: یارسول اللہ، ہم آپ سے سواریاں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حملكم الله عزوجل.

(صحیح مسلم کتاب النذور والایمان)

مانگنے آئے تھے تو آپ نے قسم کھائی تھی کہ آپ ہمیں سواری نہ دیں گے اب آپ نے دے دی ہیں۔ کیا آپ سے نسیان ہو گیا ہے۔ آپ نے فرمایا: میں بخدا، اگر اللہ نے چاہا کوئی قسم نہ کھاؤں گا مگر جب اس سے بہتر صورت دیکھ لوں گا تو اس بہتر ہی کو انجام دوں گا اور اپنی قسم کھول دوں گا۔ میں نے تمھیں سواریاں نہیں دیں یہ تو اللہ تعالیٰ نے تمھیں ان پر بٹھا دیا ہے۔"

امت کو بھی آپ نے یہی نصیحت کی کہ بہتر اور بھلے کام کو کیا جائے اور قسم کو نیکی کے کام میں رکاوٹ نہ بننے دیا جائے۔ آپ نے حضرت عبدالرحمان بن سمرہ رضی اللہ عنہ کو نصیحت کی:

اذا حلفت على يمين فر ايت غيرها خيراً منها فكفر عن يمينك وائت الذى هو خير.

(صحیح بخاری۔ کتاب الایمان والنذور)

"جب تم کسی کام کی قسم کھا بیٹھو۔ پھر کسی اور کام کو اس سے بہتر پاؤ تو اپنی قسم کا کفارہ ادا کر کے بہتر کام انجام دو۔"

ایک اور روایت میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں:

والله لا ان يلج احدكم بيمينه فى اهله آثم له عند الله من ان يعطى كفارته التى فرض الله.

(بخاری کتاب الایمان والنذور)

"اللہ کی قسم تم میں سے کوئی اپنی قسم خاص طور پر جو بیوی سے متعلق ہو، پورا کرنے پر بے جا اصرار کرے، اللہ کے ہاں زیادہ گناہ گار ہو گا۔ اس سے کم تر بات یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ کفارہ ادا کر کے قسم سے باہر نکل آئے۔"

خلاصۂ بحث

قرآنِ مجید میں جو احکام بیان ہوئے ہیں، سچے مسلمانوں کو چاہیے کہ ان پر اصل روح کے ساتھ عمل کرے۔ اسے قرآن کے ظاہر و باطن کو ماننا اور دونوں کو دل جمعی سے بجالانا ہے۔ وہ دیکھے کہ قرآنِ حکیم کے الفاظ کا بظاہر

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

کیا مفہوم ہے اور آیاتِ الٰہی کا نظم اور اسلوبِ کلام کس طرف اشارہ کر رہا ہے کس چیز پر زور (stress) دیا گیا ہے اور کسے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جو بات صراحتہً ذکر کی گئی ہے اور جو اشارۃً بتائی گئی ہے، ان میں کیا فرق ہے اور دونوں میں سے کون سی زیادہ اہم ہے اور کس پر عمل مطلوب ہے۔ مومن کے شایاں نہیں کہ پیچھے رہ کر رخصت پر عمل کرے اور تہمت والزام سے بچنا اپنا شعار بنا لے۔ اسے ایک قدم آگے بڑھ کر عمل اور عزیمت کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ اللہ ہی توفیق دینے والا اور لغزشوں سے محفوظ رکھنے والا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

حسن کارکردگی

دنیا میں آدمی کو اپنے کام پر ستایش اور پزیرائی ملتی ہے، لیکن اس کے پیچھے مسلسل محنت، استقامت اور اپنی جگہ بنانے کی محنت کی تاریخ ہوتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگ موجود ہیں جو بڑے کامیاب ڈاکٹر ہیں۔ زمانہ ان کی لیاقت اور صلاحیت کا معترف ہے۔ کچھ لوگ غیر معمولی انجینئر ہیں۔ جہاں کوئی بڑی فنی مشکل یا غیر معمولی منصوبہ بندی پیشِ نظر ہو لوگ ان سے رجوع کرتے ہیں۔ بعض غیر معمولی صنعت کار ہیں۔ انھوں نے بہت بڑی صنعتی ایمپائر کھڑی کر دی ہے۔ چند عظیم فن کار ہیں۔ لوگ ان کے فن کے دل دادہ ہیں اور فن کی دنیا میں ان کی بہت مانگ ہے۔

لیکن کیا یہ محض ان اصحاب کی لیاقت ہے، جس کا نتیجہ انھیں حاصل ہو گیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہونہار طالبِ علم اپنی تعلیم کے آخری سال میں کسی حادثے کا شکار ہو جاتا ہے اور موت اسے اس دنیا سے لے جاتی ہے۔ اسی طرح دوسرے شعبوں کا حال ہے۔ کچھ لوگ غیر معمولی نظر آرہے ہوتے ہیں لیکن وقت انھیں مساعی دکھانے کی مہلت نہیں دیتا۔ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو اپنی صلاحیتوں کو بیان کرتے ہیں، کوئی بڑا کاروباری بن سکتا ہے، لیکن اسے سرمایہ دستیاب نہیں۔ کسی میں پڑھنے کی بڑی صلاحیت ہے لیکن اس کے والدین اسے تعلیم نہیں دلا سکتے۔

غرض یہ کہ یہاں کامیابی اور ناکامی سرتاسر ذاتی لیاقت پر مبنی نہیں ہے۔ اس کے لیے موافقت کرنے والے حالات درکار ہیں اور یہ حالات صرف قدرت مہیا کرتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہماری سعی کا ہونا ضروری ہے، لیکن کوئی سعی کتنی کامیاب ہو گی اور کتنے نتائج پیدا کرے گی اس کا اصل انحصار پروردگارِ کائنات کی حکمت و مصلحت پر ہے۔

اِس دنیا میں حسنِ کارکردگی کا معاملہ یہی ہے۔ لیکن اس کے بعد جو دنیا آنے والی ہے اس میں حسنِ کارکردگی کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہاں کے لیے چلا گیا ایک قدم، وہاں کے لیے خرچ کی گئی ایک دمڑی اور وہاں کے لیے بولا گیا ایک لفظ اپنی پوری قیمت پائے گا۔ حالات نامساعد تھے، قیمت بڑھ جائے گی۔ جدوجہد جاں گسل تھی، اجر میں غیر معمولی اضافہ ہو جائے گا۔ وہاں ستایش اور پزیرائی نہ ملنے کا کوئی امکان نہیں۔

صبر

صبر کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو یہ کہ آدمی اپنی بات پر قائم رہے اور دوسرا یہ کہ کسی موقف کے اختیار کرنے پر مشکلات پیش آئیں تو غلط رویہ اختیار نہ کرے۔

عام زندگی میں بھی مشکلات پیش آتی ہیں۔ احباب و اقربا اس پر صبر کرنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ رونے دھونے اور دل چھوٹا کرنے کے بجائے اس مشکل کو حوصلے سے برداشت کرلو۔

دین کی تعلیمات میں بھی صبر کی ہدایت شامل ہے۔ اس ہدایت کا تعلق عام زندگی کی مشکلات سے بھی ہے اور ان مشکلات سے بھی جو راہِ حق کے اختیار کرنے میں پیش آتی ہیں۔ عام زندگی کی مشکلات، مثلاً بیماری، مالی نقصان یا رزق کی کمی اور گھریلو یا خاندانی مسائل میں بھی صبر کرنا چاہیے۔ یہاں صبر کا اطلاق خدا پر توکل، صرف آخرت کی کامیابی اور خدا کی رضا کے لیے صحیح رویہ اختیار کرنے پر ہوتا ہے۔ زبان پر حرفِ شکایت لانا، تقدیر کے خلاف احتجاج کرنا، بظاہر جو لوگ سبب بنے ہوئے ہیں ان پر غصہ کھانا اور اسی نوعیت کے دوسرے ردِ عمل صبر کے منافی ہیں۔ شکایت سے بلند ہو جانا، تقدیر کے خیر و شر پر ایمان رکھنا اور اپنی کوتاہی کی تلافی کرنا اور لوگوں کی خطاؤں کو معاف کر دینا صبر کا صحیح اظہار ہے۔

دینی زندگی اختیار کرنے پر بھی مشکلات پیش آتی ہیں۔ یہ مشکلات وہ مخالفت بھی ہے، جو آدمی کو ماحول کی طرف سے پیش آتی ہے اور قدرت کی طرف سے پیش آنے والے حالات بھی ہیں جو آدمی کے قولِ ایمان کی گہرائی اور استحکام کے متعین کرنے کے لیے پیدا کیے جاتے ہیں۔ اب اگر آدمی مخالفت سے گھبرا جائے اور مخالفین کے ساتھ بنا کر رکھنے کے لیے دین پر عمل میں کمی کی طرف راغب ہو جائے یا اللہ کی طرف سے آنے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

والی کسی آزمایش پر حوصلہ چھوڑ دے اور اس آزمایش سے نکلنے کے لیے دین یا دین کے کسی جز کو چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے تو یہ چیز صبر نہیں ہے۔ صبر یہ ہے کہ آدمی حق پر ڈٹ جائے۔ ماحول کی مخالفت ہو یا قدرت کی آزمایش ہر حال میں اپنے رب کی بات کو پکڑ کر رکھے۔

گویا صبر دل کے عزم، حوصلے کی بلندی، قدم کی مضبوطی اور منفی ردِ عمل سے گریز کا نام ہے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

منظور الحسن

اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی

درسِ قرآن کے بعد سوال و جواب کی نشست میں جناب جاوید احمد صاحب غامدی سے یہ سوال کیا گیا کہ اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی کیا ہوتی ہے؟ اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی کے دو بنیادی اصول ہیں: ایک، حق و عدل پر قیام رہنا اور بوقتِ ضرورت اس کی شہادت دینا اور دوسرے، دنیا میں ظلم و عدوان کے خلاف جدوجہد کرنا۔ ان اصولوں کی روشنی میں پالیسی ریاست کے اربابِ حل و عقد خود وضع کریں گے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

عدل و انصاف کے اصول کی وضاحت کرتے ہوئے جاوید صاحب نے قرآنِ مجید کی ان آیات کا حوالہ دیا:

> "ایمان والو، انصاف پر قائم رہنے والے بنو، اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے، اگرچہ اس کی زد خود تمھاری اپنی ذات، تمھارے والدین اور تمھارے اقربا ہی پر پڑے۔ کوئی امیر ہو یا غریب، اللہ ہی دونوں کے لیے احق ہے۔ اس لیے تم خواہشِ نفس کی پیروی نہ کرو کہ حق سے ہٹ جاؤ اور اگر اسے بگاڑو گے یا اعراض کرو گے تو یاد رکھو کہ اللہ تمھارے ہر عمل سے باخبر ہے۔" (النساء۴: ۱۳۵)

> "ایمان والو، عدل پر قائم رہنے والے بنو۔ اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے، اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس طرح نہ ابھارے کہ تم عدل سے پھر جاؤ۔ عدل کرو یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ تمھارے ہر عمل سے باخبر ہے۔" (المائدہ۵: ۸)

جاوید صاحب کا یہ جواب مسلمانوں کے لیے اس منہاج کی نشان دہی کرتا ہے جو انھیں دنیا میں شرف و وقار کی منزل تک لے جا سکتا ہے۔ اس راہ پر چلنے کا مطلب یہ ہے کہ مذہبی جذبات، قومی تعصبات یا مالی مفادات اگر مسلمانوں کو حق و عدل کی بات کہنے سے روکیں تو یہ اُن کے ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ ان رکاوٹوں کو دور کر کے

عدل وانصاف کی حمایت میں کھڑے ہو جائیں۔

عدل کا معنی یہ نہیں ہے کہ محض جرم و سزا کے معاملات میں انصاف کو قائم رکھا جائے، بلکہ عدل ایک رویے اور ایک قدر کا نام ہے۔ سچ عین عدل اور جھوٹ خلافِ عدل ہے، دیانت عین عدل اور بد دیانتی خلافِ عدل ہے، پورا تول عین عدل اور کم تول خلافِ عدل ہے، ایفاے عہد عین عدل اور عہد شکنی خلافِ عدل ہے، رواداری عین عدل اور تعصب خلافِ عدل ہے۔

مسلمانوں کو اپنے قومی معاملات میں بھی اور بین الاقوامی تعلقات میں بھی عدل و انصاف کو ایک بنیادی اصول کے طور پر اختیار کرنا چاہیے۔ وہ اس رویے کو اس سطح تک لے جائیں کہ اپنی قوم کی حمیت بھی انھیں عدل سے ہٹنے نہ دے اور دوسری قوم کی دشمنی بھی انھیں عدل سے پھرنے نہ دے۔ موجودہ زمانے میں نظریاتی اختلافات، سرحدوں کے تنازعات، لین دین کے معاملات اور صلح و جنگ کے مسائل آئے روز یہ سوال پیدا کرتے ہیں کہ کون سی بات عدل کے مطابق ہے اور کون سی بات خلافِ عدل ہے؟ ان تمام موقعوں پر مسلمانوں کے نمائندوں کو پوری ذمہ داری اور نیک نیتی کے ساتھ عدل وانصاف کی بات کرنی چاہیے۔ یہ رویہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی انھیں مقبول بنائے گا اور اس کے نتیجے میں وہ دنیا میں بھی کوئی مثبت عملی کردار ادا کر سکیں گے۔

یہ ذمہ داری محض مسلمانوں کے نظمِ اجتماعی کی نہیں ہے، بلکہ ہر فرد اس کا ذمہ دار ہے۔ یہ افراد ہی کے رویے ہوتے ہیں جن کی عکاسی کسی قوم کا اجتماعی وجود کرتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی فرد اپنی اجتماعیت میں قیامِ عدل کا خواہاں ہے تو اسے سب سے پہلے اپنے وجود پر اس قدر کو نافذ کرنا چاہیے اور اس معاملے میں ہر طرح کی عصبیت اور تفاخر کو بالاے طاق رکھ دینا چاہیے۔ سیدہ عائشہ فرماتی ہیں کہ:

> ''(باثر) مخزومیہ قبیلے کی ایک عورت نے جب چوری کی تو اس کے معاملے میں قریش کو بڑی فکر ہوئی۔ لوگوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ کون شخص ایسا ہو سکتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی سفارش کرے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ اس کی جرأت صرف اسامہ بن زید کر سکتے ہیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے چہیتے ہیں۔ لوگوں کے کہنے پر اسامہ نے حضور سے اس کی سفارش کی۔ حضور نے فرمایا: اسامہ، تم اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود میں سے ایک حد کے معاملے میں سفارش کرنے آئے ہو؟ پھر آپ خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا: لوگو، تم سے پہلے قوموں کو اسی چیز نے تباہ کیا کہ ان کا حال یہ ہو گیا تھا کہ ان میں کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور اگر کوئی عام آدمی چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خدا کی قسم میں ایسا نہیں کروں گا۔ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔'' (متفق علیہ)

ظلم و عدوان کے خلاف جدوجہد کرنے کا معاملہ بھی بہت اہم ہے۔ ایک پہلو سے دیکھیں تو اسلام کا پیغام ہی امن و سلامتی ہے۔ وہ دنیا سے ظلم و زیادتی کے ہر عنصر کو ختم کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ انسانی زندگی کی نشوونما کی بنیاد جان، مال اور آبرو کی حفاظت پر ہے۔ اسلام ان معاملات میں فرد یا اجتماع کی ہر تعدی اور ہر ظلم کو روکتا ہے۔

مسلمان ریاستوں کو اپنی خارجہ پالیسی اس اصول پر استوار کرنی چاہیے کہ وہ دنیا کو ظلم و زیادتی کی آماج گاہ نہ بننے دیں اور اس مقصد کے لیے انھیں اگر اپنے افراد کی جانیں بھی قربان کرنی پڑیں تو اس سے دریغ نہ کریں۔ وہ اگر ظلم و عدوان کو قوت سے مٹانے کی اہلیت اور ہمت اپنے اندر نہیں پاتے تو انھیں کم سے کم اس کے خلاف آواز ضرور بلند کرنی چاہیے۔ دنیا میں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو یا غیر مسلموں پر، ہر دو صورتوں میں انھیں اس کے خلاف پورے جذبے اور حکمت کے ساتھ جدوجہد کرنی چاہیے۔ مسلمان اجتماعی اور انفرادی، دونوں سطحوں پر یہ رویہ اپنے اندر پیدا کریں کہ وہ عدل و انصاف اور امن و سلامتی کے داعی اور ظلم و زیادتی سے نفرت کرنے والے ہوں۔ کسی فرد یا قوم کی دشمنی یا مخالفت بھی انھیں اس پر آمادہ نہ کر سکے کہ وہ ظلم و زیادتی کا طرزِ عمل اختیار کریں۔ جب قریشِ مکہ نے مسلمانوں کو مکہ اور بیت اللہ میں داخل ہونے سے روک دیا اور مسلمانوں نے غم و غصے کا اظہار کیا تو قرآنِ مجید نے انھیں یہ تعلیم دی کہ:

''کسی قوم کی دشمنی، کہ اس نے تمھیں مسجدِ حرام سے روکا ہے، تمھیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم حدود سے تجاوز کرو۔ تم نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو، گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ سخت پاداش والا ہے۔'' (المائدہ ۵: ۲)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی/منظور الحسن

جاوید احمد صاحب غامدی کے درسِ قرآن و
حدیث کے بعد پوچھے گئے سوالات سے انتخاب

تزکیۂ نفس کا طریقہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سوال: کیا کوئی ایسی ترکیب ہے جسے استعمال کر کے تزکیۂ نفس کی منزل کو حاصل کیا جا سکتا اور آفات اور شیطانی وسوسوں سے بچا جا سکتا ہے؟

جواب: میں نے ہمیشہ یہ عرض کیا ہے کہ اس معاملے میں ادھر اُدھر سے ترکیبیں پوچھنے کے بجائے اس راستے پر گامزن رہنا چاہیے جو اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے اور جس پر صحابہ ء کرام چلے۔ اس راستے پر چلتے ہوئے نتائج، بے شک جلدی نہیں نکلتے، مگر جب نکلتے ہیں تو بڑے محکم اور پائیدار ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں ان تین باتوں کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیجیے:

۱۔ قرآنِ مجید کی تلاوت کو روزمرہ کا معمول بنائیے۔

تلاوت سے مراد بے سوچے سمجھے الفاظ کی تکرار کرنا نہیں ہے بلکہ ہدایت طلبی کے پورے شعور کے ساتھ مطالعہ کرنا ہے۔

۲۔ مسجد کے ساتھ اپنے تعلق کو پوری طرح قائم رکھیے۔

۳۔ ہفتے میں کچھ نہ کچھ وقت نیک لوگوں کی صحبت میں گزاریے۔

یہ تین نکات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ماخوذ ہیں۔ یہی سلوکِ محمدی ہے۔ آپ اگر اس کے علاوہ

کوئی دوسرا اسلوک یا طریقہ اختیار کریں گے تو اس کا شدید اندیشہ ہے کہ آپ آفات سے بچنے کے بجائے آفات کا شکار ہو جائیں۔ اپنے نفس کو آلایشوں سے پاک کرنے کے بجائے اسے آلودہ کر لیں۔ اللہ کے قرب اور اس کی فرماں برداری کی منزل کو پانے کے بجائے مشرکانہ مشاغل اختیار کر کے اس منزل سے دور ہوتے چلے جائیں اور اپنی دانست میں تزکیۂ نفس کو حاصل کرنے کے باوجود حقیقت میں اس سے محروم رہیں۔

خضر علیہ السلام

سوال: حضرت خضر علیہ السلام کون تھے؟

جواب: اس بارے میں مولانا امین احسن اصلاحی کی رائے یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نبی تھے۔ اس رائے کا اظہار انھوں نے ''تدبر قرآن'' میں سورۂ کہف کی تفسیر میں کیا ہے۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی رائے یہ ہے کہ وہ فرشتہ تھے۔ اس معاملے میں، میں اپنے جلیل القدر استاد کی رائے کے بجائے مولانا مودودی صاحب کی رائے کو صحیح سمجھتا ہوں۔ وہ میرے نزدیک کارکنانِ قضا و قدر ہی میں سے تھے۔

وتر کی قضا

سوال: نمازِ وتر اگر چھوٹ جائے تو کیا اس کی قضا پڑھی جائے گی؟

جواب: حنفی نمازِ وتر کو واجب قرار دیتے ہیں، اس لیے ان کے نزدیک وتر اگر چھوٹ جائیں تو ان کی قضا ہو گی۔ میرے نزدیک وتر اصل میں تہجد کی نماز ہے۔ تہجد کی نماز نفل ہے، اس لیے اس کی قضا نہیں ہو گی۔ بعض لوگوں کی کمزوری کے پیشِ نظر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تہجد کی نماز کو اس کے اصل وقت سے پہلے پڑھنے کی اجازت دی، اس لیے عام لوگوں نے اسے عشا سے متصل کر کے پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ نماز چونکہ وتر یعنی طاق ہوتی ہے، اس لیے اس کو وتر کہا جانے لگا۔ بہر حال یہ ایک نفل نماز ہے اور نفل نماز کی قضا نہیں ہوتی۔

آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار

سوال: کیا آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہو گا؟

جواب: یہ بات کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہو گا، امورِ متشابہات میں سے ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ

علیہ وسلم سے منسوب بعض روایات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ سعادت نصیب ہو گی۔ لیکن یہ سعادت کیسے نصیب ہو گی اس کا ذکر روایات میں نہیں ملتا۔ احادیث میں جو باتیں درج ہیں وہ یہ ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کو ایسے ہی دیکھو گے جیسے کھلے آسمان پر چاند کو دیکھتے ہو۔

اس موقع پر ہماری کیفیت کیا ہو گی؟ ہماری آنکھیں اس نظارے کا کیسے تحمل کر سکیں گی؟ یہ سب باتیں امورِ متشابہات میں شامل ہیں۔ ان کے بارے میں ہمیں اپنے اندازے لگانے کے بجائے اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔

شادی میں والدین کی رضامندی

سوال: کیا شادی میں والدین کی رضامندی ضروری ہے؟

جواب: قرآنِ مجید نے ہمیں یہ ہدایت دی ہے کہ نکاح معاشرے کے معروف کے مطابق ہونا چاہیے۔ کسی صالح معاشرے کے اندر اس معاملے میں جو ضوابط ہیں، جو روایات ہیں، جو رسوم و رواج ہیں، انھی کے مطابق اس ذمہ داری کو انجام پانا چاہیے۔ ہمارے معاشرے میں اس ذمہ داری کو انجام دینے کے لیے نہ صرف والدین سرگرم ہوتے ہیں، بلکہ دیگر اعزہ اور احباب بھی اس عمل میں شریک ہوتے ہیں۔ اسی سے رشتوں میں حسن پیدا ہوتا ہے، اسی سے اچھی معاشرت وجود میں آتی ہے اور یہی ہمارا معروف ہے۔

اگر کسی موقع پر والدین اپنے بچوں کی ترجیحات کو یکسر نظر انداز کر دیں اور ناجائز طور پر اپنی مرضی ان پر مسلط کرنا چاہیں تو اس معروف کی خلاف ورزی جائز ہو سکتی ہے، لیکن اس معاملے میں غلط یا صحیح کا تعین کسی معاملے کو سامنے رکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی موقع پر والدین کا موقف درست ہو اور کسی موقع پر اولاد کی بات ٹھیک ہو۔

صحیح بات یہ ہے کہ اس معاملے میں اولاد اور والدین دونوں ہی کو اعتدال کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ نہ والدین کو سختی اور جبر سے کام لینا چاہیے اور نہ اولاد کو نافرمانی اور انحراف کی روش اختیار کرنی چاہیے۔ باہمی موافقت اور محبت سے یہ معاملہ انجام پانا چاہیے۔

خودکشی میں رضاے الٰہی

سوال: کیا خودکشی کرنے والے کی تقدیر میں یہ بات پہلے سے لکھ دی جاتی ہے کہ وہ خودکشی

کرے گا، اور کیا اس میں اللہ کی مرضی بھی شامل ہوتی ہے؟

جواب: خود کشی کے عمل میں اللہ تعالیٰ کی مرضی شامل نہیں ہوتی، بلکہ اس کا اذن شامل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں آزمایش کے لیے انسانوں کو اس بات کی اجازت دے رکھی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے برائی یا ظلم کا ارتکاب کر لیتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ اجازت نہ دیتے تو آزمایش ناممکن تھی۔ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے برائی اور بھلائی کا شعور دے کر اس دنیا میں بھیجا ہے اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔ اس صورتِ حال میں جب کوئی شخص خود کشی کا اقدام کرتا ہے تو وہ در حقیقت اپنے عمل سے اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مجھے دنیا میں بھیجنے کا فیصلہ غلط تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک بڑا سنگین جرم ہے، اس میں خدا کی رضا کیسے شامل ہو سکتی ہے؟

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

قارئین کے خطوط و سوالات
پر مبنی جوابات کا سلسلہ

اجماعِ امت

سوال: : اجماعِ امت کی کیا حیثیت ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کسی مسئلے پر ایک دور کے تمام اہلِ علم متفق ہوں؟ کیا اجماع کو ذاتی اجتہاد سے منسوخ کیا جا سکتا ہے؟ (محمد صفتین، راولپنڈی)

جواب: اجماع کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اجماع کسی امر کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کرنے پر ہوتا ہے۔ یہ اجماع حجت ہے اور اس سے اختلاف تو کجا گریز یا انحراف بھی جائز نہیں ہے۔ کوئی اجتہاد اس میں تبدیلی نہیں کر سکتا، خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی۔ دوسرا اجماع کسی فقہی یا تفسیری رائے پر ہوتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس اجماع کا وقوع ثابت کرنا ہی ممکن نہیں۔ جن امور پر اجماع کا دعویٰ کیا جاتا ہے، بالعموم، وہ محض دعویٰ ہے اور اگر اس دعویٰ کو مان بھی لیا جائے تو وہ امر چونکہ اصل دین یعنی قرآن و سنت کا ہم پلہ نہیں ہے، لہٰذا اس سے اختلاف کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

سود، کرایہ اور زراعت

سوال: : سود کی علتِ حرمت کیا ہے؟ مزارعت اور کرایہ کیوں سود میں شمار نہیں ہوتے؟ جبکہ اس میں مالک کو نقصان کا احتمال بھی نہیں ہوتا۔ سود میں روپے کی ڈیویلیوایشن کا خیال کیوں نہیں رکھا جاتا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت پر بٹائی کو سود قرار دیا تھا اس حدیث کی کیا توجیہ ہے؟ (محمد صفتین، راولپنڈی)

جواب: سود کا تعلق صرف قرض سے ہے۔ ہر وہ معاملہ جس میں لین دین کرتے ہوئے قرض کی صورت

پیدا ہوتی ہو اور کسی نوع کا اضافہ کر دیا جائے، وہ سود ہو گا۔ کرائے اور مزارعت میں ظاہر ہے قرض کا معاملہ نہیں ہوتا۔ کرایہ تو صرف کسی شے کو استعمال کرنے کا معاوضہ ہے۔ مزارعت اپنی حقیقت کے اعتبار سے پارٹنر شپ ہے۔ اگر اس میں ظلم یا ناانصافی کا کوئی پہلو نہ ہو تو یہ جائز ہے۔ عرب میں مزارعت کی بعض ایسی صورتیں رائج تھی جن میں ظلم اور ناانصافی کا پہلو موجود تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھی صورتوں کو غلط قرار دیا تھا۔

نماز کے بعد ذکر بالجہر

سوال: نماز کے بعد ذکر بالجہر کو کیوں بدعت قرار دیا جاتا ہے جبکہ قرآن و حدیث میں ذکر کے فضائل بیان ہوئے ہیں اور ذکر کا لفظ عموم پر دلالت کرتا ہے خواہ ذکر جہری ہو یا سری، انفرادی ہو یا اجتماعی۔ اس کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث شریف ہے کہ حلال وہی ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال قرار دیا ہے اور حرام بھی وہی ہے اور باقی مباح ہے؟ (محمد صفتین، راولپنڈی)

جواب: روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام سلام پھیرنے کے بعد فوراً نہیں اٹھتے تھے بلکہ کچھ دیر بیٹھے رہتے اور تسبیح و تہلیل اور دعا کے کلمات پڑھتے رہتے۔ لیکن یہ عمل انفرادی طور پر کیا جاتا تھا، کسی کی آواز بلند ہوتی اور کسی کی پست۔ یہی طریقہ اب بھی اختیار کیا جائے تو درست ہے۔ لیکن اگر کچھ کلمات کو خصوص واہتمام کے ساتھ اور لازمی امر کی حیثیت سے کیا جائے تو یہ بدعت ہو گی۔ جائز اور مشروع امور ہی صورت اور ہیئت کی تبدیلی سے بدعت بن جاتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ابو سلمان سراج الاسلام حنیف

ایک حدیث کی تحقیق

''اشراق'' جون ۲۰۰۰ میں ''عرس، تصوف اور اسلام'' کے عنوان سے محمد بلال صاحب کی ایک تحریر شائع ہوئی تھی۔ اس تحریر میں بلال صاحب نے مولانا عبد القدوس صاحب ہاشمی کی ایک تحقیق سے اقتباس نقل کیا تھا جس میں ضمناً ایک روایت بھی زیر بحث آئی تھی۔

جناب ابو سلمان سراج الاسلام حنیف نے اس تنقید پر تنقید کی ہے۔ ہم اُن کے شکر گزار ہیں اور ان کا مکتوب ذیل میں شائع کر رہے ہیں۔ جو حضرات اس موضوع پر لکھنا چاہیں ''اشراق'' کے صفحات ان کے لیے حاضر ہیں۔ (ادارہ)

''اشراق'' جون ۲۰۰۰ کا مطالعہ کیا۔ ماشاءاللہ ردِ بدعات کے سلسلے میں تحقیق کا حق ادا کر دیا۔ ''عرس'' اور ''آزر'' کے متعلق لکھے گئے مضامین اچھے ہیں۔ ''آزر'' سے متعلق امام سیوطی کے اعتراضات کا جائزہ لیا جاتا تو بہتر ہوتا۔ ردِ منکر کا فریضہ بہت اہم فریضہ ہے۔ ''اشراق'' کا اس سلسلے میں اٹھایا ہوا یہ قدم قابل تحسین ہے۔

مجھے صفحہ ۳۰ پر درج ایک حدیث کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔ عزت مآب جناب محمد بلال صاحب نے ''مقالاتِ ہاشمی'' کا ایک اقتباس من و عن نقل کیا ہے۔ میرے نزدیک مولانا عبد القدوس صاحب ہاشمی ندوی کی وہ تحقیق جو حدیث 'نم کنومة العروس' سے متعلق ہے، محلِ نظر ہے۔

محترم محمد بلال صاحب نے مولانا ندوی کی تحقیق پر اعتماد کرتے ہوئے اُن کی پوری عبارت نقل کی ہے۔ لیکن میں اس ''بلا تحقیق نقل'' کو اشراقی اقدار کے منافی سمجھتا ہوں۔

مولانا ہاشمی صاحب حدیث 'نم کنومة العروس' سے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ:

۱۔ خود امام ترمذی بھی اس روایت کو صحیح نہیں بلکہ حسن وغریب بتاتے ہیں۔

۲۔ اس حدیث کی رواۃ میں پہلے راوی جنھوں نے اس کو سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے ان کا نام ہے: 'سعید بن ابی سعید المقبری۔ ان سے متعلق ائمۂ جرح و تعدیل کا بیان ہے کہ آخر میں خبطی ہو گئے تھے۔ اس لیے ان کی روایتیں قابل قبول نہیں ہیں۔

۳۔ دوسرے راوی عبد الرحمٰن بن اسحاق سخت مجروح اور غیر معتبر ہیں۔

۴۔ اس روایت کے تیسرے راوی کو بھی ''غیر محمود فی الحدیث'' بتایا گیا ہے۔

۵۔ اس طرح ائمۂ حدیث نے اس روایت کو بہت ہی ضعیف قرار دیا ہے۔

حالانکہ:

۱۔ اگرچہ امام ترمذی نے اس روایت کے سلسلے میں اپنے شک کا اظہار کرتے ہوئے اسے حسن غریب فرمایا ہے لیکن محققین ان سے اس سلسلے میں اتفاق نہیں کرتے۔ دورِ حاضر کے نامور محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں: اسناده جيد۔ 'رجاله كلهم ثقات'[۱]۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۲۔ مولانا ہاشمی صاحب کا یہ جملہ کہ ''سعید بن ابی سعید کے متعلق ائمہ جرح و تعدیل کا بیان ہے کہ آخر میں خبطی ہو گئے تھے۔ اس لیے ان کی روایتیں قابلِ قبول نہیں ہیں۔'' میرے نزدیک ایک بہت بڑی جسارت اور غیر معقول ہے اس لیے کہ:

الف۔ اگر ان کی سب روایتیں نا قابلِ قبول ہیں تو پھر یہ صحاح ستہ کے راوی کیوں ہیں اور اصحابِ صحاح نے ان سے روایتیں کیوں لیں؟

ب۔ خبطی راوی کے بارے میں یہ قاعدہ کسی محدث نے ذکر نہیں کیا ہے کہ اس کی روایتیں قابلِ قبول نہیں ہوتیں۔ اس کے برعکس قاعدہ یہ ہے کہ ایسے راوی نے اختلاط سے پہلے جو روایتیں بیان کی ہیں وہ مقبول ہیں اور جو اختلاط کے بعد بیان کی ہیں وہ غیر مقبول ہیں اور جن کی قبلیت و بعدیت کا علم نہ ہو سکے وہ حصولِ علم پر موقوف رہیں گی: 'والحكم فيه ان ما حدث قبل اختلاط اذا تميز قبل۔ واذا لم يتميز توقف فيه، وكذا من اشتبه الامر فيه'[۲]۔

۱۔ سلسلہ الاحادیث الصحیحۃ ۳: ۳۸۰۔ حدیث ۱۳۹۱۔

۲۔ شرح نخبۃ الفکر فی مصطلح اھل الاثر، حافظ ابن حجر، ص: ۱۰۴-۱۰۵۔ مکتبۃ الغزالی۔ دمشق۔

ج۔ اس کا بھی کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں کہ سعید بن ابی سعید خبطی ہو گئے تھے۔ البتہ امام شعبہ جب ان سے روایت لے کر بیان فرماتے ہیں تو یوں کہتے ہیں: 'حدثنا سعید بعد ما کبر'[3]۔ اس میں نہ اختلاط کا ذکر ہے اور نہ خبطی ہونے کا، البتہ ان کے بڑھاپے کا ذکر ہے۔ حافظ ابنِ عدی فرماتے ہیں: 'وارجو ان سعیداً من اھل الصدق، وقد قبله الناس، وردی عنه الائمة والثقات من الناس، وما تکلم فیه احد الا بخیر'[4]۔

واقدی کا بیان ہے کہ: سعید خبطی ہو گئے تھے: 'قال واقدی: کان قد کبر حتی اختلط قبل مرته باربع سنین'[5]۔ لیکن حافظ ذہبی فرماتے ہیں: 'ثقة، حجة، شاخ ووقع فی الھرم ولم یختلط'[6]۔

۳۔ مولانا ہاشمی لکھتے ہیں: دوسرے راوی عبد الرحمان بن اسحاق سخت مجروح اور غیر معتبر ہیں۔

مجھے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ان کا یہ دعویٰ بھی قطعاً بے بنیاد ہے، کیونکہ محدثین کے یہ ریمارکس عبد الرحمان بن اسحاق بن الحارث ابو شیبتہ الواسطی الکوفی ابن اخت النعمان بن سعد الانصاری کے بارے میں ہیں۔ ملاحظہ ہو امام مزّی کی تہذیب الکمال ۱۶: ۵۱۵-۵۱۸ ترجمہ ۳۷۵۴، جب کہ زیرِ بحث سند کے راوی عبد الرحمان بن اسحاق بن عبد اللہ بن الحارث بن کنانتہ القرشی المدنی ہیں، جو سعید کے شاگردِ رشید اور بشر بن مفضل کے استاذِ محترم ہیں اور حدیث کے معاملے میں ثقہ، مقبول اور صالح ہیں۔ تفصیل کے لیے مطالعہ فرمائیں، تہذیب الکمال ۱۶: ۵۱۹-۵۲۵ ترجمہ ۳۷۵۵۔

۴۔ مولانا محترم راوی کا نام لیے بغیر فرماتے ہیں: اس روایت کے تیسرے راوی کو بھی 'غیر محمود فی الحدیث' بتایا گیا ہے۔ مولانا صاحب اگر اس 'غیر محمود فی الحدیث' راوی کا نام لکھتے تو اچھا ہوتا لیکن ہم بتاتے ہیں کہ ان دو راویوں کے علاوہ اس روایت کے دو راوی اور ہیں جو یہ ہیں:

الف۔ بشر بن المفضل بن لاحق الرقاشی ابو اسماعیل جو امام ترمذی کے استاذ الاستاذ ہیں، ان کے متعلق حافظ

۳۔ الکامل فی ضعفاء الرجال ۴: ۴۴۴۔

۴۔ الکامل فی ضعفاء الرجال ۴: ۴۴۴؛ تہذیب التہذیب ۴: ۳۴-۳۵۔

۵۔ تہذیب الکمال ۱۰: ۴۷۰۔

۶۔ میزان الاعتدال ۲: ۱۳۹۔

ابنِ حجر لکھتے ہیں: 'ثقه ثبت عابد'[7]۔

ب۔ یحییٰ بن خلف ابو سلمہ، جو امام ترمذی کے استاذ ہیں، انھیں بھی حافظ ابن حجر 'صدوق' فرماتے ہیں[8]۔

ان دو راویوں کے علاوہ اسی سند میں کوئی راوی نہیں جسے مولانا ہاشمی ''غیر محمود فی الحدیث'' بتاتے ہیں یا مولانا ان دونوں ثقہ راویوں میں سے کسی ایک کے بارے میں یہ جرح فرماتے ہوں گے جو کسی طرح قرینِ انصاف نہیں ہے۔

۵۔ مولانا ہاشمی صاحب لکھتے ہیں: اسی طرح ائمۂ حدیث نے اس روایت کو بہت ہی ضعیف قرار دیا ہے۔

یہ بھی صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ اس لیے کہ مولانا نے کسی محدث کا نام اپنے اس دعویٰ پر پیش نہیں کیا ہے۔ یہ روایت صحیح ہے اور اسے ترمذی کے علاوہ درجِ ذیل محدثین نے بھی نقل کیا ہے:

ابن حبان: موارد الظمان: ۱۹۷ حدیث ۷۸۰: الاحسان ۷: ۳۸۶ حدیث ۳۱۱۷۔

ابن ابی عاصم: السنتہ ۲: ۴۱۶-۴۱۷ حدیث ۸۶۴۔

الآجری: الشریعۃ: ۳۶۵۔

البغوی: شرح السنۃ ۵: ۴۱۶: المصابیح ۱: ۱۴۸ حدیث: ۹۲۔

المنذری: الترغیب والترہیب ۴: ۱۷۳ حدیث ۱۸۔

آخر الذکر یہ بھی فرماتے ہیں کہ: ''العروس'' يطلق على الرجل وعلى المرأة ما داما فى اعراسهما. اللهم ارزقنا علماً نافعاً و عملاً متقبلاً. ربنا اغفرلنا ولا خواننا الدين سبقونا بالايمان ولا تجعل فى قلوبنا غلاً للذين امنوا ربنا انك رؤف رحيم. اٰمين۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۷۔ تقریب التہذیب: ۴۵۔

۸۔ تقریب التہذیب: ۵۷۳۔

خیال و خامہ

جاوید

O

علم آزردہ ہے اپنی حسرتِ تعمیر میں
شام آپہنچی افق پر اِس جہانِ پیر میں

میں نے چاہا تھا کہ دیکھوں خواب کچھ تیرے لیے
اور تو ظالم ، الجھ کر رہ گیا تعبیر میں

جانتے ہو ، کس لیے ہے شعلہ افشانی مری؟
ہے ابھی شاید کوئی حلقہ تری زنجیر میں

کھینچ کر اُس کو نہ رسوا ہوں کبھی مردانِ حق
دم اگر باقی نہ ہو کچھ سینۂ شمشیر میں

یہ جہاں وہ ہے کہ اِس میں اُن کو دیکھا چاہیے
صفحۂ عالم پہ اُن کی شوخیِ تحریر میں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com